

ملتِ اسلامیہ کا علمی اور اصلاحی مجلہ

# مَحَلِّت

نمبر ۲۰۰۱ء

۲۵۶

- ✽ رمضان المبارک: مقاصد اور نتائج از سید داود غزنوی
- ✽ اُم المؤمنین حضرت عائشہؓ کی نکاح اور رخصتی کی عمر
- ✽ رویت ہلال اور مطالع کا اختلاف



مجلس التحقیق الاسلامی

## ماہنامہ محدث کا اجمالی تعارف

مدیر اعلیٰ: حافظ عبدالرحمن مدنی      مدیر: ڈاکٹر حافظ حسن مدنی

ماہنامہ محدث کی ابتداء انڈیا سے نکلنے والے ایک رسالے کی ہی ارتقائی شکل ہے۔ جامعہ رحمانیہ دہلی سے نکلنے والا ایک رسالہ جس کا نام محدث ہی تھا اسی کو پروان چڑھاتے ہوئے تقسیم ہند کے بعد دوبارہ ماہنامہ محدث کے ہی نام سے پاکستان میں عظیم اسکالر حافظ عبدالرحمن مدنی نے اس کا اجراء کیا اور 1979 سے لے کر اب تک کامیابی و کامرانی سے شائع ہو رہا ہے۔ اور محدث کی علمی پہچان کے حوالے سے اتنا ہی کافی ہے کہ ماہنامہ محدث ہر صاحب علم و فضل کی ضرورت بن چکا ہے کیونکہ اس کے مضامین جدید فکر کے حامل اور ملحدانہ افکار کے لیے تلوار بے نیام کی حیثیت رکھتے ہیں۔

## اجرائے محدث کے مقاصد

عناد اور تعصب سے بالاتر ہو کر اسلام کی ابدی تعلیمات کو فروغ دینا

دین اسلام پر غیر مذاہب کے حملوں کا دفاع کرنا

قوانین و مسائل اسلامیہ کو نرم کر کے اسلامی روح کو کمزور کرنے والے عناصر کی بیخ کنی کرنا

علوم جدیدہ سے بہرہ ور کر کے انسانی افکار کو ارتقاء تک لے جانا

اتباع قرآن و سنت کی طرف والہانہ دعوت دینا

وحدت امت کو قائم رکھتے ہوئے سلف صالحین کے متفقہ فہم کا پرچار کرنا

اور

صحابہ، تابعین، محدثین اور تمام آئمہ کرام سے محبت کے جذبات کو پروان چڑھانا اس علمی و فکری مجلے کا شعار ہے یقینی طور پر ماہنامہ محدث علمی، تحقیقی، معلوماتی اور انتہائی شائستہ زبان رکھنے والے مضامین کا ایک حسین امتزاج ہے



ملت اسلامیہ کا علمی و اصلاحی مجلہ

لاہور

# مُحَدِّث

ماہنامہ

حافظ حسن مدنی

ڈپٹی

حافظ عبد الرحمن مدنی

ڈپٹی ایڈیٹر

فہرست مضامین

۲ رمضان المبارک اُسوۂ محمدی اور یادگار قرآن مولانا سید داؤد غزنوی

۱۹ فطری نظام تخلیق..... قرآن و سنت کی روشنی میں مولانا عبد الغفار حسن

۱۳ بلا اجازت لڑکی کا نکاح، فاتحہ کی قراءت کا مکمل..... حافظ ثناء اللہ مدنی

۲۶ رؤیت ہلال اور مطالع کا اختلاف مولانا محمد صدیق

۴۳ حضرت عائشہ کی نکاح اور رخصتی کی عمر مولانا عبد الرحمن مدنی

۶۰ انسانی حقوق شریعت کی میزان میں! محمود بن محمد عقیق شہید علی امام سہروردی

جلد ۳۳ / شمارہ ۱۱  
رمضان المبارک ۱۴۲۲ھ  
نومبر ۲۰۰۱ء

زر سالانہ ۲۰۰ روپے  
فی شمارہ ۲۰ روپے

چونکہ ممالک  
زر سالانہ ۲۰ روپے  
فی شمارہ ۲ روپے

Monthly MUHADDIS A/c No: 984  
UBL - Model Town Crossing, Lahore

دفتر کا پتہ

۹۹ جے، ماڈل ٹاؤن  
لاہور 54700

Ph: 5866476, 5866396, 5839404  
Email: hhasan@wol.net.pk

محرم الحرام کی روشنی میں اسلام کی حقیقت کا احاطہ ہے اور اس کا غرض ان کے لیے انسانی ضروری نہیں

ISLAMIC RESEARCH COUNCIL

Publisher: Hafiz Abdul Rahman Madani  
Printer: Shirkat Printing Press, Lahore

بسم الله الرحمن الرحيم

مولانا سید داود غزنوی

فکر و نظر

## رمضان المبارک

### نزول قرآن مجید کی یادگار اور اُسوۂ محمدی کے قیام کے ہدایت

﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنَاتٍ مِّنَ الْهُدَىٰ وَالْفُرْقَانِ فَمَن شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ، وَمَن كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللَّهَ عَلَىٰ مَا هَدَاكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ﴾ (البقرة: ۱۸۵)

”رمضان وہ مبارک مہینہ ہے جس میں قرآن حکیم نازل ہوا، جو انسانوں کے لئے موجب ہدایت ہے، اور جس کی تعلیم میں ہدایت و ضلالت اور حق و باطل کی تمیز کے لئے کھلے نشان موجود ہیں، پس جو اس مہینے میں زندہ موجود ہو، وہ روزے رکھے، اور جو مریض ہو یا مسافر وہ ان کے بدلے دوسرے دنوں میں پھر روزے رکھ لے۔

خدا تمہارے لئے آسانی چاہتا ہے، سختی نہیں چاہتا، تاکہ تم روزوں کی تعداد پوری کر سکو، اور روزے اس لئے فرض ہوئے کہ تم اس عطاے ہدایت پر خدا کی بڑائی کرو اور شکر بجالاؤ۔“

قرآن مجید نے مذکورہ آیات میں روزے کا حکم دیتے ہوئے ہمیں ماہِ صیام کی اصل حقیقت، مقصد اور اس کے نتائج کی اطلاع دی ہے، ہم ان آیات قرآنی کے مضامین کو ان تین عنوانوں کے تحت تقسیم کر سکتے ہیں:

اول: اصل حقیقت ماہِ صیام      دوم: مقصد صیام      سوم: نتائج صیام

### اول: حقیقت ماہِ صیام

سب سے پہلے یہ فرمایا کہ رمضان المبارک کے مقدس مہینے میں اقلیم رسالت اور کشور نبوت کے سب سے بڑے تاجدار محمد بن عبد اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام پر نامہ خیر و برکت اور دستورِ ہدایت قرآن حکیم کا نزول ہوا اور یہ اس وقت ہوا جبکہ آپ غارِ حرا کے اندر انسانی آبادی سے دور، مادی ضروریات سے کنارہ کش ہو کر کئی کئی روز بھوکے اور پیاسے رہ کر راتوں کو اٹھ اٹھ کر مشغولِ دعا تھے اور انسانوں کو گراہی، باطل پرستی، سرکشی اور تمرد سے نکالنے کے لئے سربسجود رہتے تھے۔ پس رمضان المبارک یا ماہِ صیام کی اصل حقیقت

نزول قرآن کی یادگار اور تذکار ہے، فرمایا:

﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ﴾ (البقرة: ۱۸۵)

”رمضان وہ مبارک مہینہ ہے جس میں قرآن حکیم نازل ہوا“

اور حامل و مبلغ قرآن علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اُسوۂ حسنہ کی اقتدار اور اتباع ہے۔ فرمایا:

﴿فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ﴾

”تم میں سے جو شخص اس مہینے میں زندہ موجود ہو، وہ روزے رکھے“

## انبیاء کرام کا اُسوۂ حسنہ

قرآن کریم میں انبیاء کرام کے اعمالِ حیات اور وقائعِ زندگی کو اس لئے پیش کیا گیا ہے کہ ان کی اقتدار کی جائے اور ان کے اُسوۂ حسنہ کی تاسی (پیروی) کی جائے۔ انبیاء کرام میں سے حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کے اعمالِ حیات کو ایک خاص عظمت و شرف اور اہمیت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اور لوگوں کو اس کے اتباع کی اس طریق پر دعوت دی، اور فرمایا:

﴿قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِي إِبْرَاهِيمَ وَالَّذِينَ مَعَهُ﴾ (الممتحنہ: ۴)

”یقیناً تمہارے لئے ابراہیم کی زندگی میں اور ان لوگوں کی زندگی میں جو ایمان کے اعلیٰ مدارج

میں ان کے ساتھ نظر آتے ہیں، پیروی اور اتباع کے لئے بہترین نمونہ ہے۔“

جس طرح قرآن کریم نے حضرت ابراہیمؑ کی مبارک زندگی کو بطور اُسوۂ حسنہ کے دنیا کے سامنے

پیش کیا، اسی طرح ہمارے نبی اکرم ﷺ کی پاکیزہ زندگی اور اعمالِ حیات کو بھی اُسوۂ حسنہ کے طور پر پیش کیا اور فرمایا:

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ (الاحزاب: ۲۱)

”یقیناً تمہارے لئے رسول اللہ کے اعمالِ حیات میں بہترین نمونہ رکھا گیا ہے۔“

یہی دو انبیا ہیں جنہیں یہ شرفِ مخصوص حاصل ہے کہ قرآن نے ان کی پاکیزہ زندگیوں کے لئے

’اُسوۂ حسنہ‘ کا لفظ استعمال کر کے دنیا کے لئے انہیں بہترین نمونہ کے طور پر پیش کیا اور ان کے عملوں کو ہمیشہ کے لئے محفوظ کر کے ضائع ہونے سے بچا دیا۔

## اُسوۂ ابراہیمیؑ

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اولاد کو بے آب و گیاہ سرزمین پر لاکر بسایا کہ خدا کی تحمید و تقدیس بجالائیں۔ خدا نے حضرت ابراہیمؑ سے ان کے عزیز فرزند کی قربانی طلب کی۔ باپ بیٹا دونوں نے اس قربانی کو پیش کیا۔ اللہ تعالیٰ کو اپنے پیارے بندوں کی یہ مخلصانہ ادائیں کچھ اس طرح بھائیگیں کہ

اس موقع کی ہر حرکت کو ہمیشہ کے لئے قائم کر دیا اور اس کو ہمیشہ دنیا میں زندہ رکھنے کے لئے اس موقع کی ہر ہر ادا کو پیروانِ دین حنیف پر فرض کر دیا گیا، اور یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ ہر سال جب حج کا موسم آتا ہے تو لاکھوں انسانوں کے عمل سے اُسوۂ ابراہیمی جلوہ نما ہوتا ہے، اور ان میں سے ہر تنفس وہ سب کچھ کرتا ہے جو آج سے کئی ہزار برس پہلے خدا کے دو مخلص بندوں نے وہاں کیا تھا۔ یہی وہ دائمی بقا ہے جس کا ذکر یوں ہے:

﴿وَوَهَبْنَا لَهُمْ مِنْ رَحْمَتِنَا وَجَعَلْنَا لَهُمْ لِسَانَ صِدْقٍ عَلِيًّا﴾ (البقرة: ۱۲۹)

”ہم نے حضرت ابراہیمؑ اور ان کی اولاد کو اپنی رحمت سے بہت بڑا حصہ دیا اور ان کے لئے اعلیٰ و اشرف ذکرِ خیر دنیا میں باقی رکھا۔“

## اُسوۂ محمدی

حضرت ابراہیمؑ نے خدا کے حضور یہ دعا والتجا کی تھی کہ

﴿رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ إِنَّكَ أَنْتَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ﴾ (البقرة: ۱۲۹)

”اے پروردگار! میری اولاد میں سے ایک ایسا رسول بھیج جو تیری آیتیں پڑھ کر سنائے، کتاب و سنت کی تعلیم دے اور تمام ناپاک عقائد سے ان کو پاک کر دے۔“

خدا نے حضرت ابراہیمؑ کی دعا قبول کی اور اس معلم کتاب و سنت کو مبعوث فرمایا اور دنیا کے سامنے ’اُسوۂ محمدی‘ کو پیش کیا۔ اس اُسوۂ عظیمہ کا سب سے پہلا منظر عالم ملکوتی میں وہ استغراقِ تام تھا، جبکہ صاحبِ سنت یا صاحبِ اُسوہ انسانوں کو ترک کر کے خدا کی صحبت اختیار کئے ہوئے تھا اور انسانوں کے بنائے ہوئے گھروں کو چھوڑ کر غارِ حرا کے تیرہ و تاریک حجرے میں گوشہ نشین ہو گیا تھا۔ وہ اس عالم میں کئی کئی راتیں جمالِ الہی کے بے کیف نظارے میں بسر کرتا رہتا تھا تا آنکہ اس تنگ و تاریک غار کے اندر قرآن کا نور طلوع ہوا، اور خدا کو اپنے پیارے بندے کی اس ماہ میں مخلصانہ عبادت، گوشہ نشینی، بھوک پیاس اور راتوں کو جاگنا کچھ ایسا پسند آیا کہ دنیا میں اُسوہِ حسنہ کے طور پر اس کو ہمیشہ زندہ رکھا۔ پس جس طرح خدا تعالیٰ نے دینِ حنیفی کے داعیِ اول کے اُسوۂ حیات کو دواِ متبختی، اسی طرح دینِ حنیفی کے آخری مکمل اور مُتَمِّم وجود کے اُسوہِ حسنہ کو بھی ہمیشہ کے لئے قائم کر دیا۔

آپ راتوں کو بارگاہِ الہی میں مشغولِ عبادت رہتے تھے، پس پیروانِ اُسوۂ حسنہ اور تبعینِ سنتِ محمدیہ بھی رمضان المبارک کی راتوں میں قیامِ لیل کرنے لگے اور تلاوت و سماعتِ قرآنِ مجید سے وہ تمام برکتیں ڈھونڈنے لگے جو اس ماہِ مبارک کو قرآنِ حکیم کے نزول سے حاصل ہوئیں۔ آپ اپنا گھر بار چھوڑ کر ایک تنہا گوشہ میں خلوت نشین ہوتے تھے۔ پس ہزاروں مؤمنینِ قانتین اس ماہِ مقدس میں اعتکاف کے



لئے مساجد میں گوشہ نشین ہونے لگے، اور اس طرح غارِ حرا کے اعتکاف کی یاد ہر سال زندہ ہونے لگی۔ آپ بھوکے پیاسے رہتے تھے، لہذا تمام مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ تم بھی بھوکے پیاسے رہو، تاکہ ان برکتوں اور رحمتوں میں سے حصہ پاؤ جو نزول قرآن کے مبارک دنوں کے لئے مخصوص تھیں۔

چنانچہ جس طرح اُسوۂ ابراہیمی کی یادگاری جرج کو فرض کر کے قائم رکھی گئی، اسی طرح اُسوۂ محمدی کی بھی یادگاری رمضان المبارک کی صورت میں قائم رکھی گئی جو چودہ سو برس گزر جانے کے بعد بھی زندہ ہے اور ان شاء اللہ ابد الابد تک زندہ رہے گی۔

## رمضان المبارک

رمضان المبارک کیا ہے؟ سعادتِ انسانی اور ہدایتِ اقوام و ملل کے ظہور کی وہ عظیم الشان یادگار ہے جس کا دروازہ قرآن حکیم کے نزول سے دنیا پر کھلا۔ یہی مہینہ خدا کی سب سے بڑی رحمت و برکت کے نزول کا ذریعہ بنا اور اسی مہینہ میں خدا کی رحمتوں کی صدیوں کے بعد بارش ہوئی اور اسی عہد میں دنیا کی وہ سب سے بڑی خشک سالی ختم ہوئی جو چھ سو سال سے بنی نوع انسان کے قلب و روح پر چھائی ہوئی تھی اور اسی موسم میں آیام اللہ کی وہ بہار آئی جس میں کوہِ فاران کی چوٹیوں پر ابرِ رحمت نمودار ہوا تاکہ کشورِ انسانیت کی سوکھی کھیتوں کو سرسبز کرے اور کائناتِ ارضی کی تشنگی ہدایت کو سیراب کرے۔

## لیلۃ القدر

اور وہ کون سی رات تھی؟ جس میں سعادتِ انسانی کا یہ مبارک پیغام آیا جس کی تبلیغ صادق و مصدوق محمد عربی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سپرد ہوئی، جس میں وحی الہی کا دروازہ غارِ حرا کے گوشہ نشین پر کھلا، وہ عزت و حرمت کی رات تھی۔ وہ ہزاروں راتوں بلکہ ہزاروں مہینوں سے بہتر رات تھی، کیونکہ اس رات ہم پر برکاتِ ربانی کی سب سے پہلی بارش ہوئی۔ اس رات خزینہ نبوت کے حامل قلب پر کلام الہی کے اسرار سب سے پہلے منکشف ہوئے۔ یہ فرشتوں کی آمد کی رات تھی۔ اس رات آسمان کی باتیں زمین والوں کو سنائی گئیں اور اسی رات عصیاں و سرکشی کی تاریکی میں مبتلا اور ظلم و تعدی سے مضطرب اور بے چین دنیا کو امن اور سلامتی کا پیغام ملا

﴿إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ وَمَا أَدْرَاكَ مَا لَيْلَةُ الْقَدْرِ لَيْلَةُ الْقَدْرِ خَيْرٌ مِّنْ أَلْفِ شَهْرٍ تَنَزَّلُ الْمَلَائِكَةُ وَالرُّوحُ فِيهَا بِإِذْنِ رَبِّهِمْ مِّنْ كُلِّ أَمْرٍ سَلَامٌ هِيَ حَتَّىٰ مَطْلَعِ الْفَجْرِ﴾

”ہم نے قرآن کو عزت و حرمت والی رات میں اتارا، اور ہاں تمہیں کیا معلوم کہ عزت و حرمت والی رات کیا ہے؟ وہ رات ہزار مہینہ سے بہتر ہے، جس میں ارواحِ مقدسہ اور فرشتے حکم الہی

احکام لے کر نازل ہوتے ہیں۔ اس رات میں طلوع صبح تک سلامتی ہی سلامتی ہے“ (سورۃ القدر)

## قیام رمضان

یہ انہی احسانات و انعامات الہیہ کا شکر یہ ہے کہ مسلمان دن بھر کی بھوک اور پیاس کے بعد عجب جوش اور محویت کے عالم میں رات کو خدا کی یاد کے لئے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ دنیا کا ذرہ ذرہ خاموش اور موخواب ہوتا ہے، لیکن شیفتگانِ سنتِ محمدیہ اپنے بستر کو خالی کر دیتے ہیں اور اسی کی حمد و ثنا میں مشغول ہو جاتے ہیں، جس نے اس ظلمت کدہ عالم میں صرف ہمیں ایک ایسا چراغ بخشا جس سے ہمارے قلوب منور ہو گئے۔ اسی کی تسبیح و تقدیس کے نغمے بلند کرتے ہیں جس نے اقوام عالم میں ہمیں یہ عزت بخشی کہ ہم نے اس کے رسول کی دعوت کو قبول کیا اور اس کی سنت کو زندہ کیا

سبحان ذی الملك والملكوت، سبحان ذی العزة والعظمة والهيبة والقدرة  
والكبرياء والجبروت، سبحان الملك الحي الذي لا ينام ولا يموت، سبوح قدوس  
ربنا رب الملائكة والروح (کنز العمال: ۲۰۶۳، ۲۲۶۶۱)

”اس حکومت اور شہنشاہی والے کی تقدیس، اس عزت و عظمت، ہیبت و قدرت، کبریائی اور جبروت والے کی تقدیس ہو۔ اس زندہ بادشاہ کی تقدیس ہو جو نہ کبھی سوتا ہے اور نہ کبھی مرتا ہے، پاک اور قدوس ہے ہمارا رب، اور تمام فرشتوں اور روحوں کا رب۔“

## دوم: مقصدِ صیام

یہ ایک حقیقتِ مسلمہ ہے کہ انسان جسم اور روح سے مرکب ہے، اور جس قدر روح میں پاکیزگی اور طہارت ہوگی، اسی قدر انسان ملکوتی صفات کا مظہر اور حامل ہوگا، اور جس قدر انسان کھانے پینے اور لذائذِ شہوانی میں زیادہ منہمک ہوگا، اسی قدر قوائے بہیمیہ مشتعل اور قوائے ملکئہ کو شکست دینے کے درپے ہوں گے۔ چونکہ قوائے بہیمیہ کی قوت و طاقت کا دار و مدار کھانے پینے اور لذائذِ شہوانیہ میں انتہاک پر ہے، اسی لئے ظاہر ہے کہ نفس کی قہر مانی کو شکست دینے اور قوائے بہیمیہ کو کمزور کرنے کے لئے ان اسباب و دواعی کو کم کرنے کی ضرورت ہے جن سے قوائے بہیمیہ کو طاقت اور ملکوتی صفات کو شکست ملتی ہے۔ اور یہی مقصدِ روزہ کا ہے جس کی طرف آیتِ زیبِ عنوان میں اشارہ کیا گیا ہے، لیکن اصل مقصد چونکہ عبادتِ روح ہے نہ کہ تعذیبِ جسم، اس لئے اسلام نے تکلیفِ جسم کو اس قدر شدید اور ناقابلِ برداشت نہیں بنایا کہ اس سے اصل مقصد فوت ہو جائے۔ اس لئے سال بھر میں صرف ایک مہینہ روزوں کے لئے مخصوص کر دیا، جس میں قرآن مجید کا نبی الرحمہ پر نزول ہوا، تاکہ یہ مبارک مہینہ قرآن مجید کے نزول کی یادگار ہو اور روزوں کے ذریعے روح کی پاکیزگی اور طہارت کا سبب بھی ہو۔



چونکہ اصل مقصد تقویٰ اور تزکیہٴ روح ہے، نہ کہ تغذیبِ جسم جیسا کہ دوسرے مذاہب میں خیال کیا جاتا ہے، اس لئے تغلیلِ غذا اور لذائذِ شہوانیہ کی ایسی صورت قائم کر دی جو سوائے معذور انسانوں کے باقی سب کے لئے قابلِ عمل اور آسان ہو۔ کیونکہ تغلیلِ غذا کی دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں: ایک تو یہ کہ مقدارِ غذا کم کر دی جائے اور دوسرا یہ کہ خوراک کے مختلف اوقات میں معتاد وقفہ سے زیادہ وقفہ کر دیا جائے۔ اسلام نے اور دوسرے مذاہب نے بھی تغلیلِ غذا کی دوسری صورت کو تجویز کیا ہے۔

اس لئے کہ پہلی صورت یعنی مقدارِ غذا کو کم کر دینا اگر روزہ قرار دیا جاتا تو اوّل یہ کسی قاعدہ اور ضابطہ کے ماتحت نہ ہوتا کیونکہ اگر کم وزن مقرر کر دیا جاتا تو یہ اختلافِ ملک، اختلافِ آب و ہوا، اختلافِ مزاج اور اختلافِ قوی کی بنا پر کسی حالت میں درست نہ ہوتا اور اگر ہر ایک شخص کے لئے انفرادی طور پر حکم ہوتا کہ اپنی معتاد غذا کا نصف کھاؤ یا اس سے کم و بیش تو یہ بھی ایک ناقابلِ عمل چیز تھی، کیونکہ ہر ایک انسان کی اگرچہ ایک معتاد غذا ضرور ہے لیکن پھر بھی ہر شخص کو اپنی معتاد غذا کا ٹھیک نصف یا تہائی کرنا اور ایک لقمہ بھی کم و بیش نہ ہونے دینا قریباً ناممکن ہے، اور ثانیاً اس سے قانون اور ضابطہ کی وہ عمومیت جو اس کی سب سے بڑی صفت ہے، جاتی رہتی لہذا تغلیلِ غذا کی دوسری صورت اختیار کی، یعنی خوراک کے اوقات میں معتاد اوقات سے زیادہ فاصلہ جس سے بھوک اور پیاس محسوس ہو اور قوائے بہیمیہ کی پامالی ہو اور روح کو طہارت اور پاکیزگی حاصل ہو۔

اسلام نے اس بھوک، پیاس اور ترکِ لذائذِ شہوانیہ کو اس قدر سخت اور ناقابلِ عمل نہیں بنایا کہ یہ مقصود بالذات ہو جائے اور جو اصل مقصد ہے، وہ فوت ہو جائے۔ اس کے لئے ضرورت ہے کہ اسلامی عبادت و ریاضت کا دوسرے مذاہب سے مقابلہ کر کے دکھایا جائے تاکہ معلوم ہو کہ ارشادِ خداوندی ﴿يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ﴾ کس قدر اپنے اندر ناقابلِ تردید صداقت رکھتا ہے۔

دوسرے مذاہب نے تکلیف و تغذیبِ جسمانی کو بھی ایک قسم کی عبادت بلکہ بہترین اقسامِ عبادت میں سے قرار دیا ہے۔ اور اسی تخیل کا یہ اثر ہے کہ یہودیوں کے ہاں قربانی اس قدر طویل و کثیر رسوم پر مشتمل تھی جس کی صرف شرائط اور لوازمات کا بیان تورات کے چار پانچ صفحات میں مذکور ہے۔ افطار کے وقت صرف ایک دفعہ کھا سکتے تھے، اس کے بعد دوسرے روز کے وقت افطار تک کچھ نہیں کھا سکتے تھے [یعنی مستقل سحری کھانے کی اجازت نہ تھی]۔ اور اگر بغیر کھائے ہوئے بد قسمتی سے نیند آ گئی تو پھر کھانا مطلق حرام تھا۔ ایامِ صیام کی پوری مدت میں بیویوں کی مقاربت بھی حرام تھی۔

عیسائی راہبوں نے رہبانیت کی بنیاد ڈالی تو انہوں نے شرعی بیاہ کو بھی اپنے اوپر حرام کر دیا، اور

ترک آسائش ولذائزِ جسمانی ان کے ہاں بہترین عبادت تھی۔ قربان گاہ، صلیب اور کنواری کے بت کے آگے گھٹنوں کے بل گھٹنوں جھکے رہنا، کئی کئی روز کھانا پینا چھوڑ دینا زہد و تقویٰ کی انتہا سمجھی جاتی تھی۔

ہندو جویوں نے تپسیا اور ریاضتِ شاقہ کی اور بھی عجیب و غریب رسم ایجاد کی۔ ان کے ہاں سالہا سال تک کھڑے رہنا، سخت دھوپ میں بغیر کسی سائے کے کھڑا رہنا، جاڑوں میں ننگے بدن رہنا، تمام جسم پر راکھ ملنا، دس دس برس تک ایک ہاتھ کو ہوا میں بلند رکھنا اور ایک ایک چلہ تک کھانا پینا بالکل چھوڑ دینا تقرب الی اللہ کے حقیقی راستے سمجھے جاتے تھے۔

ان میں جینیوں کا فرقہ پیدا ہوا تو اس نے ناک، منہ اور کان کو بند رکھنا شروع کیا تاکہ ان کے تنفس کے ذریعے کسی کیڑے کو اذیت نہ ہو۔ ہندوؤں میں بُدھ کا فرقہ پیدا ہوا تو اس کے بھکشو جنگلوں اور پہاڑوں میں رہنے لگے اور گھاس، پتوں اور بھیک کے ٹکڑوں پر گزر کرنے کو زہد و اتقا کی علامت سمجھنے لگے، جس کی معمولی سی یادگار اس وقت بھی برما میں موجود ہے۔

لیکن اسلام نے رہبانیت کی تمام شکلوں کو ناجائز قرار دیتے ہوئے یہ اعلان فرمایا: ”لا رہبانیۃ فی الاسلام“ (اسلام میں کسی قسم کی رہبانیت نہیں ہے) یہود و نصاریٰ جس رہبانیت پر فخر کرتے تھے، اس کے متعلق یہ فرما کر رہبانیت کی حقیقت بے نقاب کر دی کہ

﴿وَرَهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ﴾ (الحج: ۲۷)

”یہ رہبانیت ان کی اپنی ایجاد ہے، ہم نے ان کو اس قسم کا کوئی حکم نہیں دیا“

غرض اسلام نے تعذیبِ جسمانی اور ریاضتِ شاقہ کو خلافِ منشا دین اور انسان کی ضعیف گردن کے لئے بارگراں سمجھ کر اس کو غلط قرار دیا اور پیغمبر اسلام کی تعریف میں یہی فرمایا:

﴿وَيَصْعَعُ عَنْهُمْ إِصْرُهُمْ وَالْأَغْلَالُ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ﴾ (الاعراف: ۱۵۷)

”اور اس طوق و زنجیر کو جو شدید احکام کی، ان کی گردن پر پڑی ہوئی تھی، علیحدہ کرتا ہے۔“

اور روزوں کے حکم کے بعد خاص طور پر فرمایا:

﴿يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ﴾ (البقرة: ۱۸۵)

”خدا تمہارے ساتھ آسانی چاہتا ہے، سختی نہیں۔“

☆ اسلام نے صیام کے سلسلہ میں جو آسانیاں اُمّتِ مسلمہ کے لئے پیش کی ہیں، ان کے مطالعہ سے اس آیت کی پوری پوری تشریح سامنے آ جاتی ہے، مثلاً اسلام کے سوا دوسرے مذاہب میں شب و روز کا روزہ ہوتا تھا، اسلام نے روزے کی مدت صرف صبح صادق سے شام تک قرار دی

﴿حَتَّى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ثُمَّ أَتُمُوا

الصَّيَّامَ إِلَى اللَّيْلِ ﴿البقرة: ۱۸۷﴾

”کھاؤ پیو یہاں تک کہ رات کے تاریک خط سے صبح کا سپید خط ممتاز ہو جائے۔ پھر روزے کو ابتداءً شب (شام) تک پورا کرو۔“

بعض لوگ عمر بھر روزے رکھتے تھے، اسلام نے اس کو بالکل ممنوع قرار دیا۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ”لا صام من صام الأبد“ (ابن ماجہ)  
”جس نے ہمیشہ روزہ رکھا، اس نے کبھی روزہ نہیں رکھا۔“

☆ ایامِ صیام میں رات کو سو جانے کے بعد پھر کھانا حرام تھا، اسلام نے اس کو منسوخ قرار دیا جیسا کہ بخاریؒ کی روایت ہے کہ صحابہ کرامؓ ابتداءً اسلام میں جب روزہ رکھتے اور افطار کا وقت آ جاتا اور وہ افطار کرنے سے پہلے سو جاتے تو پھر رات بھر اور دن بھر دوسرے دن کی شام تک کچھ نہ کھاتے۔ اس اثنا میں قیس بن صرمہ انصاری جو روزہ سے تھے، افطار کا وقت آیا تو وہ اپنی بیوی کے پاس آئے اور ان سے پوچھا کہ تمہارے پاس کچھ کھانے کو ہے، انہوں نے کہا: ہے تو نہیں لیکن چل کر ڈھونڈتی ہوں، قیس دن بھر کام کر کے تھکے تھے، سو گئے۔ بیوی آئیں تو افسوس کر کے رہ گئیں، جب دوپہر ہوئی تو قیس کو غش آ گیا، یہ واقعہ آنحضرت سے بیان کیا گیا، اس وقت یہ آیت نازل ہو:

﴿وَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتَّى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ﴾ ﴿البقرة: ۱۸۷﴾

”کھاؤ پیو، یہاں تک کہ رات کے تاریک خط سے صبح کا سپید خط ممتاز ہو جائے۔“

☆ اسلام سے پہلے ایامِ صیام کی پوری مدت میں مقاربت سے محترز رہتے تھے لیکن چونکہ یہ ممانعت انسان کی فطری خواہش کے بالکل منافی تھی، اس لئے اکثر لوگ اس میں خیانت کے مرتکب ہوتے تھے۔ اسلام نے اس حکم کو صرف روزہ کے وقت تک محدود رکھا جو صبح سے شام تک کا زمانہ ہے۔ فرمایا:

﴿أَجَلٌ لَّكُمْ لَيْلَةُ الصَّيَّامِ الرَّفَثُ إِلَى نِسَاءِكُمْ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنْتُمْ لِبَاسٌ لَهُنَّ عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُونَ أَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ فَالْآنَ بَاشِرُوهُنَّ وَابْتَغُوا مَا كَتَبَ اللَّهُ لَكُمْ﴾ ﴿البقرة: ۱۸۷﴾

”تمہارے لئے روزہ کی شب میں اپنی بیویوں سے مقاربت حلال کی گئی، تمہارا ان کا ہمیشہ کا ساتھ ہے۔ خدا جانتا ہے کہ تم اس میں خیانت کرتے تھے، پس اس نے تم کو معاف کر دیا۔ اب ان سے ملو جلو اور خدا نے تمہاری قسمت میں جو لکھا ہے، اس کو ڈھونڈو“

☆ اسلام میں بھول چوک اور خطا و نسیان معاف ہے، رسول اللہ ﷺ نے اُمتِ مسلمہ کو اس شرف سے مخصوص کرتے ہوئے فرمایا:

”رفع عن أمتي الخطأ والنسيان“ ”میری اُمت سے خطا و نسیان معاف کیا گیا“

اس لئے اگر حالتِ صوم میں کوئی شخص بھول چوک سے کچھ کھالے یا پی لے، تو اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا، آپ نے فرمایا:

”من أكل أو شرب ناسيا فلا يفطر فانما هو رزق الله (ترمذی)  
”جو بھول کر کھائی لے تو اس کا روزہ نہیں ٹوٹے گا، وہ تو خدا کی روزی ہے“

☆ اسی طرح وہ افعال جو گو روزہ کے منافی ہیں لیکن انسان سے قصداً سرزد نہیں ہوئے بلکہ وہ اس میں مجبور ہے، مثلاً مُحتلم ہو جانا، بلا قصد قے ہو جانی، ان چیزوں سے بھی نفقِ صوم نہیں ہوتا۔ بعض لوگ اس حدیث کی بنا پر کہ ”ایک بار آپ کو استفراغ [قے] ہوا تو آپ نے روزہ توڑ دیا“ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ استفراغ ناقضِ صوم ہے، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ آپ نے نفلی روزہ رکھا تھا۔ اتفاقی استفراغ سے بنظرِ ضعف آپ نے روزہ توڑ دیا جیسا کہ امام ترمذی نے جامع ترمذی میں لکھا ہے۔

☆ اسلام سے پہلے دوسرے ادیان میں بوڑھوں، کمزوروں، بیماروں اور معذوروں کے لئے کوئی استثناء نظر نہیں آتا، لیکن اسلام نے ان تمام اشخاص کو مختلف طریق سے مستثنیٰ قرار دیا۔ بیمار اور مسافر کے لئے فرمایا کہ وہ رمضان کے علاوہ اردنوں میں قضا روزے رکھ لیں۔

☆ عورتوں کے فطری عذرات کا لحاظ کرتے ہوئے ان کے ایامِ عادیہ، ایامِ حمل، اور ایامِ رضاعت میں رمضان کے روزے معاف کر دیئے اور ان کی بجائے دوسرے دنوں میں روزوں کی قضا یا فدیہ مقرر کر دیا۔ ابن عباسؓ نے بھی آیت ﴿وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مَسْكِينٍ﴾ کی تفسیر میں یہی لکھا ہے۔

## سوم: روزہ کے نتائج

مقصدِ صوم اور اس کے نتائج کی تشریح کے لئے آیاتِ زیبِ عنوان کے مندرجہ ذیل جملوں کی طرف توجہ فرمائیے:

﴿لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ﴾ تاکہ تم متقی بن جاؤ۔

﴿لِتَكْبَرُوا اللَّهَ عَلَىٰ مَا هَدَاكُمْ﴾ اللہ نے جو تم کو راہِ راست دکھائی ہے اس پر اللہ کی تکبیر و تقدیس کرو۔

﴿وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ﴾ تاکہ تم اس نزولِ خیر و برکت پر خدا کا شکر بجالاؤ۔

ان آیات سے معلوم ہوا کہ روزہ کے مقصد اور اس کے نتائج و آثار میں ان تین چیزوں کا ہونا

ضروری ہے: (۱) اتقا (۲) تکبیر و تقدیس (۳) حمد و شکر

اگر روزہ دار نے اپنی زندگی میں روزہ کے نتائج کے طور پر ان تینوں اُمور کو نہ پایا تو پھر یہ نہیں کہا

جاسکتا کہ روزہ رکھا گیا اور اس فرض کی انجام دہی ہوگئی۔

کیونکہ انسانی اعمال و اشغال کا وجود فی الحقیقت ان کے نتائج و آثار کا وجود ہے۔ اگر نتائج و آثار ظہور پذیر نہ ہوئے تو پھر یہ نہ کہنے کہ ان اعمال کا وجود تھا۔ اگر آپ دوڑتے چلے جا رہے ہیں کہ راستہ ختم ہو اور منزل قریب ہو، لیکن آپ غلطی سے بھٹک کر دوسرے راستہ پر جا پڑتے ہیں، جس سے آپ کی مسافت لمبی اور منزل دور تر ہوتی جاتی ہے، تو آپ کی سعی لا حاصل اور ساری تگ و دو عبث ہوتی ہے اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ آپ نے مسافت طے کر لی اور منزل پر پہنچ گئے۔ علیٰ ہذا القیاس اگر روزہ دار روزہ رکھتا ہے، کھانے پینے اور جماع سے پرہیز کرتا ہے، لیکن روزہ کے نتائج یعنی اتقا، تکبیر و تقذیس اور شکر و حمد الہی اس کے اندر نمایاں نہیں ہوتے تو اس کو روزہ دار نہیں کہا جاسکتا۔ ہم یہ کہیں گے کہ وہ فاقہ کش ہے، وہ پیاسا ہے، لیکن افسوس کہ اس کی گرسنگی [بھوک] اور تشنگی کی حیثیت اس پھول سے زیادہ کچھ نہیں جس میں رنگ و بو نہیں۔ یقیناً اس روزہ دار کی مثال ایک بے جوہر آئینہ اور بے روح جسم کی ہے، اور ہر شخص سمجھتا ہے کہ ایک جسم بے روح، ایک آئینہ بے جوہر، اور ایک بے رنگ و بو گل ایسی چیزیں ہیں جن کی کوئی قدر و قیمت نہیں، اسی حقیقت کبریٰ کی طرف نبی اکرم ﷺ نے اشارہ کیا ہے:

رُبَّ صَائِمٍ لَيْسَ لَهُ مِنْ صِيَامٍ إِلَّا الْجُوعُ وَ رُبَّ قَائِمٍ لَيْسَ لَهُ مِنْ قِيَامٍ إِلَّا السَّهَرُ

”کتنے روزہ دار ہیں جن کو روزہ سے بجز بھوک کچھ حاصل نہیں اور کتنے رات کا قیام کرنے والے

ہیں جن کو نماز سے جاگنے کے سوا کچھ فائدہ نہیں۔“ (ابن ماجہ)

یہ کون بد قسمت لوگ ہیں؟ یہ وہ لوگ ہیں جن کے پیٹ نے روزہ رکھا لیکن دل نے روزہ نہیں رکھا، ان کی زبان پیاسی تھی لیکن دل پیاسا نہ تھا، پس یہ لوگ کیونکر حوض کوثر سے اس دن اپنی پیاس بجھانے کی توقع رکھتے ہیں جس دن ہر ایک کی زبان پر العطش العطش ہوگا۔

آج روزہ داروں کی کتنی محفلیں ہیں کہ ان میں غیبت کا مشغلہ نہیں اور وہ سمجھتے ہیں کہ اس گناہ کی آلودگی اور ارتکاب سے روزہ نہیں ٹوٹتا، حالانکہ وہ اپنا روزہ توڑ چکے ہیں، لیکن وہ نہیں سمجھتے کہ وہ روزہ توڑ رہے ہیں:

الصَّائِمُ فِي عِبَادَةِ مَنْ حِينَ يَصْبِحُ إِلَى أَنْ يَمْسِيَ مَا لَمْ يَغْتَبِ فَإِذَا اغْتَابَ خَرَقَ صَوْمَهُ

”روزہ دار صبح سے شام تک عبادتِ خدا میں ہے، جب تک کسی کی غیبت نہ کرے اور جب وہ کسی

کی برائی کرتا ہے تو اپنے روزہ کو پھاڑ ڈالتا ہے۔“ (دیلی)

وہ سمجھتے ہیں کہ نفس کی اطاعت اور ہوا و ہوس کی بندگی اور عمل شر، منافی روزہ نہیں، لیکن ان کو سچا سمجھا جائے یا اس ہادیٰ برحق کو جس نے فرمایا:

”ليس الصيام من الاكل والشرب إنما الصيام من اللغو والرفث“ (حاکم)  
 ”روزہ کھانے پینے سے پرہیز کا نام نہیں بلکہ لغو اور عملِ شر سے پرہیز کا نام ہے۔“

جو لوگ جھوٹ اور عملِ بد کو روزہ کے لئے مضرب نہیں خیال کرتے اور دن بھر روزہ کے ساتھ اس میں مصروف رہتے ہیں، ان کو اپنی طرف سے کیا کہا جائے؟ اس مخبر صادق کا ارشاد پہنچائے دیتے ہیں جس کی کوئی تکذیب نہیں کر سکتا:

من لم يدع قول الزور والعمل به والجهل فليس لله حاجة أن يدع طعامه وشرابه  
 ”جو روزہ کی حالت میں جھوٹ اور جہالت کے کاموں کو نہیں چھوڑتا تو خدا کو کوئی ضرورت نہیں  
 کہ یہ روزہ دار بے کار اس کے لئے اپنا کھانا پینا چھوڑ دے۔“ (صحیح بخاری: ۲۰۵۸)

پس اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ روزہ کی حقیقت کیا ہے۔ روزہ ایک ملکوتی حالت کے ظہور کا نام ہے۔ صائم کا جسم انسان ہوتا ہے لیکن اس کی روح فرشتوں کی زندگی بسر کرتی ہے جو نہ کھاتے ہیں، نہ پیتے ہیں۔ وہ تمام مادیاتِ عالم سے پاک اور ضروریاتِ دنیوی سے منزہ اور مصروفِ تسبیح و تحمید و تقدیس ہوتے ہیں۔ اس لئے صائم بھی نہ کھاتا ہے، نہ پیتا ہے۔ وہ مادیات سے پاک اور ضروریاتِ دنیوی سے منزہ رہنے کی، جہاں تک اس کی خلقت اور فطرت اجازت دیتی ہے، کوشش کرتا ہے۔ پس صائم مجسم نیکی ہوتا ہے، وہ کسی کی غیبت نہیں کرتا، وہ کسی کو برا نہیں کہتا، وہ کسی سے جہالت نہیں کرتا، وہ اس حکم کی تعمیل کرتا ہے:

وإذا كان يوم صوم أحدكم فلا يرفث ولا يصخب فإن سابه أحد أو قاتله  
 فليقل: إني امرؤ صائم“ (صحیح بخاری: ۱۹۰۴)

”تم میں سے جب کسی کے روزے کا دن ہو تو نہ بدگوئی کرے، نہ شور و غل کرے۔ اگر اسے کوئی  
 برا کہے یا اس سے آمادہ جنگ ہو تو کہہ دے: میں روزہ سے ہوں۔“

روزہ فی الحقیقت نفس کشی کے لئے بہترین حربہ ہے اور شیطانی حملوں کی مدافعت کے لئے بہترین سپر ہے۔ وہ دنیا میں بھی سپر ہے اور آخرت میں بھی سپر ہے، دنیا میں بغاوتِ نفس کے لئے اور آخرت میں جہنم کے حملوں کے لئے اور کیوں نہ ہو جبکہ روزہ خیر محض اور نیکیِ خالص ہے اور روزہ کی جزا خود خدا دینے والا ہے

قال رسول الله ﷺ قال الله تعالى: كل عمل ابن آدم له إلا الصيام فإنه لي،  
 وأنا أجزى به والصيام جنة“ (صحیح بخاری: ۱۹۰۴)

”حدیثِ قدسی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: انسان کا تمام عمل اس کے لئے ہے لیکن روزہ میرے لئے ہے، میں اس کی جزا دینے والا ہوں اور روزہ سپر ہے۔“

پس مبارک اور خوش قسمت ہے وہ جو اس سپر کو لے کر دنیا کے کارزارِ اعمال میں آتا ہے اور خدا کی

رحمت کا مستحق ہوتا ہے، کیونکہ یہ شرف روزہ داروں کو ہی حاصل ہے کہ جب رمضان المبارک آتا ہے تو ان کے لئے رحمتِ خداوندی کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور جہنم کے دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں، جیسا کہ اس صادق و مصدوق نے فرمایا:

إذا دخل رمضان فتحت أبواب الجنة وفي رواية أبواب الرحمة وغلقت أبواب جهنم وسلسلت الشياطين (صحیح بخاری: ۱۸۹۹)

”جب رمضان شروع ہوتا ہے تو جنت کے دروازے اور دوسری روایت میں رحمت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور جہنم کے دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں اور شیاطین کو جکڑ دیا جاتا ہے“ پس مبارک ہے وہ جو روزہ کو سپر بنا کر شیاطین کے حملوں سے اپنے کو بچاتا ہے۔ مبارک ہے وہ جس پر رحمتِ خداوندی کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ مبارک ہے وہ جو ان ایام میں خدا کے لئے اپنے کھانے پینے اور جماع کو چھوڑتا ہے اور اس شرف سے مشرف ہوتا ہے جس کا اعلان اشرف الانبیاء نے اپنی زبانِ حق سے فرمایا:

كل عمل ابن آدم يضاعف الحسنة بعشر أمثالها إلى سبع مائة ضعف قال الله تعالى: إلا الصوم فإنه لي وأنا أجزي به يدع شهوته و طعامه من أجلی  
”ابن آدم کے ہر نیک کام کا بدلہ دس سے سات سو نیکوں تک دیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: مگر روزہ اس سے مستثنیٰ ہے، وہ میرے لئے ہے، میں اس کا بے حساب اجر دوں گا، کیونکہ روزہ دار میرے لئے اپنی شہوانی خواہشات اور کھانے پینے کو چھوڑتا ہے۔“ (مسلم: کتاب الصیام، ۲۷۰۱)

[ہفت روزہ ”توحید“ امرتسر..... ۱۳ فروری ۱۹۳۹ء جلد ۴/ شمارہ ۱۵، ۱۶، ۱۷]



- بلا اجازت لڑکی کا نکاح
- روح کو ایصالِ ثواب اور میت پر پھول ڈالنا
- مقتدی کیلئے سورۃ فاتحہ کی قراءت کا محل
- زکوٰۃ، سونے کی قیمت خرید پر یا قیمت فروخت پر

**سوال:** ایک والد نے اپنی جوان، بالغ لڑکی کا نکاح اس کی اجازت کے بغیر اپنے کسی رشتہ دار لڑکے سے کر دیا ہے۔ نکاح سے پہلے وہ لڑکی بر ملا پکار پکار کر کہتی رہی ہے کہ میں اس لڑکے کے ساتھ شادی کرنے پر راضی نہیں ہوں اور اب نکاح کے بعد بھی وہ لڑکی ناراضگی اور خفگی کا اظہار کرتے ہوئے اپنے رشتہ دار مردوں اور عورتوں کے سامنے رونا شروع کر دیتی ہے۔ اس نکاح کا قرآن و حدیث کی تعلیمات کی روشنی میں کیا حکم ہے؟ (عبدالوحید، ضلع قصور)

**جواب:** بالغ لڑکی کا نکاح اس کی اجازت کے بغیر نہیں ہونا چاہئے، چاہے نکاح کرنے والا اس کا باپ ہی کیوں نہ ہو، چنانچہ حدیث میں ہے: **والبکر یستأذنہا أبوہا فی نفسہا** (صحیح مسلم: ۴۵۵/۱) ”باپ کنواری لڑکی سے نکاح کے بارے میں اس سے اجازت طلب کرے۔“ علامہ ابن قیم فرماتے ہیں:

”وبہذہ الفتوی نأخذ وأنه لا بد من استئمار البکر وقد صح عنه صلی اللہ علیہ وسلم: الأیم أحق بنفسہا من ولیہا والبکر تستأمر فی نفسہا وإذنها صماتہا وفی لفظ والبکر یستأذنہا أبوہا فی نفسہا وإذنها صماتہا وفی الصحیحین عنه صلی اللہ علیہ وسلم: لا تنکح البکر حتی تستأذن، قالوا: وكيف إذنها؟ قال أن تسکت - وسألته صلی اللہ علیہ وسلم جاریة بکر، فقالت إن أباهما زوجها وهی کارهة، فخیرها النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقد أمر باستئذان البکر ونهی عن إنکاحها بدون إذنها - وخیر صلی اللہ علیہ وسلم من نکحت ولم تستأذن“ (اعلام الموقعین، ۴/۳۴۲، ۳۴۳)

”امام صاحب فرماتے ہیں: ہم اس فتویٰ کو لیتے ہیں کہ باکرہ سے اجازت لینا ضروری ہے کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بات صحیح ثابت ہے کہ بیوہ اپنے نفس کی زیادہ حقدار ہے اور کنواری سے اس کے نفس کے بارے میں مشورہ لیا جائے اور اس کی خاموشی، اجازت تصور ہوگی اور ایک روایت میں یوں ہے کہ باپ باکرہ سے اجازت طلب کرے اور اس کی اجازت اس کی خاموشی ہے نیز بخاری، مسلم میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: باکرہ کا نکاح نہ کیا جائے یہاں تک کہ اس سے اجازت لی جائے۔ لوگوں نے کہا: اس کی اجازت کیسے ہو؟ آپ نے فرمایا: اس کی خاموشی ہی اجازت سمجھی جائے گی۔“

اور آپ ﷺ سے ایک کنواری لڑکی نے سوال کیا کہ اس کے باپ نے اس کا نکاح زبردستی کر دیا ہے تو آپ ﷺ نے اس کو اختیار دے دیا اور حکم دیا کہ باکرہ سے اجازت لی جائے اور اس کی اجازت کے بغیر نکاح سے منع کر دیا اور جس سے اجازت نہ لی گئی ہو، اس کو اختیار دے دیا۔  
ان نصوص کی بنا پر اس لڑکی کو اختیار ہے کہ یہ نکاح رد کر سکتی ہے۔

**سوال:** اس حدیث کی تحقیق درکار ہے: عن ابن عباسؓ أن رسول الله ﷺ نهى عن صبر ذی الروح وعن إخصاء البهائم نهيا شديدا (مجمع الزوائد: ج ۵، ص ۲۶۵)  
اگر یہ حدیث صحیح ہے تو پھر جانور کو خسی کرنا اور خسی جانور کی قربانی کرنا کیسا ہے؟

**جواب:** حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی اس حدیث کے بارے میں امام شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: وأخرج البزار بإسناد صحيح من حديث ابن عباس يعني "ابن عباس رضی اللہ عنہ کی حدیث کو بزار نے بسند صحیح بیان کیا ہے۔ (نیل الاوطار: ۹۱/۸) اور صاحب مجمع الزوائد نے کہا: رجاله رجال الصحيح اس حدیث کے راوی صحیح کے راوی ہیں۔ (۲۶۵/۵) یعنی ان راویوں میں صحیح کے راویوں جیسے اوصاف پائے جاتے ہیں۔ علامہ شمس الحق رحمہ اللہ عظیم آبادی نے اپنے فتاویٰ میں اس مسئلہ پر خوب سیر حاصل بحث کی ہے جو لائق مطالعہ ہے۔ بحث کے آخر میں فرماتے ہیں:  
”ان تمام باتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ جن جانوروں کا گوشت نہیں کھایا جاتا، ان کا خسی کرنا جائز نہیں اور جن کا گوشت کھایا جاتا ہے، ان کا خسی کرنا افضل ہے اور عزیمت کا یہی تقاضا ہے کہ ان کا خسی کرنا جائز ہو۔“ (صفحہ ۳۳۳)

**سوال:** مسعود احمد بی ایس سی، امیر جماعت المسلمین (رجسٹرڈ) نے درج ذیل حدیث سے ثابت کیا ہے کہ سورہ فاتحہ اس وقت پڑھی جائے جب امام خاموش ہو۔

”حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: كانوا يقرأون خلف رسول الله ﷺ إذا أنصت فإذا قرأ لم يقرء وا إذا أنصت قرء وا“ (بيهقي: جزء القراءة / صلوۃ المسلمین)

اس کی سند کیسی ہے؟ اگر سند صحیح ہے تو سورہ فاتحہ کس وقت پڑھی جائے گی؟ امام کے سکتوں میں یا مروجہ طریقہ ہی صحیح ہے؟

**جواب:** اثر ہذا سند کے اعتبار سے اگرچہ قابل قبول ہے لیکن یہ اس بارے میں نص نہیں کہ دیگر مواقع پر فاتحہ کی قرأت نہیں ہو سکتی، اس کتاب کے صفحہ ۱۹ پر ہے: ابو ہریرہ کے شاگرد نے کہا فکیف أصنع إذا جهر الإمام ”جب امام جہری قرأت کرے تو مجھے کیا کرنا چاہئے؟“ جواب میں ابو ہریرہؓ نے فرمایا: اقرأ بها في نفسك ”اپنے جہری میں پڑھ لے۔“ پھر یہی نے اپنی سند کے ساتھ مکحول سے نقل کیا ہے:

اِقْرَأْ بِهَا يَعْنِي بِالْفَاتِحَةِ فِيمَا جَهَرَ بِهِ الْإِمَامُ إِذَا قَرَأَ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ وَسَكَتَ سِرًّا وَإِنْ لَمْ يَسْكُتْ اِقْرَأْ بِهَا قَبْلَهُ وَمَعَهُ وَبَعْدَهُ لَا تَتَرَكُهَا عَلَى حَالٍ  
 ”جب امام جہری قرأت کرے تو اس کی خاموشی میں مقتدی سری قرأت کرے۔ اور اگر وہ خاموش نہ ہو تو اس سے پہلے اس کے ساتھ اور اس کے بعد قرأت کو کسی حال میں مت چھوڑ۔“  
 پھر حضرت عبادہؓ کی مشہور روایت میں ہے کہ

رسول اللہ ﷺ نے صبح کی نماز پڑھائی تو قرأت کرنا مشکل ہو گیا۔ سلام پھیرنے کے بعد آپؐ نے دریافت کیا: مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ تم اپنے امام کی اقتدا میں قرأت کرتے ہو، ہم نے عرض کی: ہاں یا رسول اللہ ﷺ! آپؐ نے فرمایا سوائے فاتحہ کے کچھ نہ پڑھو، جو فاتحہ نہیں پڑھتا اس کی نماز نہیں۔“

اس حدیث میں امام کی قرأت کے وقت مقتدی کی قرأت فاتحہ کا جواز ہے، اگر سکتا میں قرأت کا تعین ہوتا تو آپ اس کی راہنمائی فرما دیتے۔ اس امر کی صراحت نہ کرنا جواز کی دلیل ہے۔ اصول فقہ کا مشہور قاعدہ ہے: تأخیر البیان عن وقت الحاجة لا يجوز  
 ”ضرورت کے وقت وضاحت کو مؤخر کرنا جائز نہیں۔“

سنن ابوداؤد کی روایت میں الفاظ یوں ہیں

فَلَا تَقْرَأُ وَابْشِئْ مِنَ الْقُرْآنِ إِذَا جَهَرْتَ إِلَّا بِأَمِّ الْقُرْآنِ

”جب میں قرأت جہری کروں تو سوائے اُمّ القرآن کے قرآن سے تم کچھ نہ پڑھو۔“

یہ الفاظ اس بارے میں نص ہیں کہ امام کی جہری قرأت کے وقت مقتدی کے لئے فاتحہ پڑھنے کا جواز ہے۔ امام شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”شوافع کا فاتحہ کی قرأت کے بارے میں اختلاف ہے کہ آیا قرأت فاتحہ امام کے سکتوں کے دوران ہوگی یا اس کی قرأت کے موقع پر؟ احادیث کے ظاہر سے معلوم ہوتا ہے کہ فاتحہ امام کی قرأت کے وقت پڑھی جائے اور امام کے سکوت کے موقع پر اگر ممکن ہو تو پڑھنا آحوط (زیادہ احتیاط) ہے کیونکہ ایسا کرنا پہلے قول والوں کے نزدیک بھی جائز ہے۔ اس پر عمل کرنا اجماع پر عمل کرنے کے مترادف ہوگا لیکن یہ معمول بنالینا کہ امام کے فاتحہ یا سورت کی تلاوت کے وقت ہی فاتحہ پڑھنے کی سعی کی جائے، ایسا کرنا کوئی مستند نہیں بلکہ سب طرح جائز اور سنت ہے۔ البتہ مقتدی کے لئے امام کی قرأت فاتحہ کے وقت فاتحہ پڑھنا زیادہ مناسب ہے۔“ (ملخصاً فی نیل الاوطار: ۲۳۴/۲)

**سوال:** زید نے بکر سے کہا کہ اگر وہ زید کو دس لاکھ روپے دے تو وہ اس کا کاروبار کر کے ہر ماہ اسے پندرہ ہزار روپے منافع دے گا جبکہ اصل رقم بھی محفوظ رہے گی۔ مزید یہ کہ بکر کا روپہار میں کسی رقم کے نقصان کا ذمہ دار نہ ہوگا، اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ (محمد شاہد، حجرہ شاہ مقیم، اوکاڑہ)

**جواب:** مضاربت کی بنیاد پر تجارت کرنا جائز ہے جس میں نفع و نقصان میں برابر مشارکت ہوتی ہے۔ نقصان میں شریک نہ ہونا اور منافع کا ماہانہ تعین کرنا، دونوں ہی سود کی قسمیں ہیں جس سے اجتناب ہر مسلمان کا فرض ہے۔

**سوال:** ایک صاحبِ نصاب شخص، جس کے پاس ساڑھے سات تولے یا اس سے زائد وزن کا سونا ہے اور اس پر سال گزر چکا ہے۔ وہ زکوٰۃ کس حساب سے ادا کرے گا جبکہ ہمارے ملک میں سونے کے دو ریٹ یعنی قیمت خرید اور قیمت فروخت رائج ہیں کیونکہ سنا سونے کے کھوٹ، پالش وغیرہ کا نام لے کر خود خریدتے ہوئے مکمل وزن کی قیمت نہیں دیتے۔ ایسا شخص زکوٰۃ قیمت خرید کے حساب سے ادا کرے گا یا قیمت فروخت کے حساب سے؟ (ابوعبید اللہ، مردان)

**جواب:** بلاشبہ زکوٰۃ خالص سونے پر ہے۔ اگر وہ ڈلی کی صورت میں ہے تو اس میں کھوٹ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اگر وہ زیور کی صورت میں ہے تو اس کی زکوٰۃ میں فقہاء اُمت کا اختلاف ہے، زیادہ احتیاط والا مسلک یہ ہے کہ خالص سونے کا حساب لگا کر زیور کی زکوٰۃ ادا کی جائے۔ زکوٰۃ کی ادائیگی میں حساب قیمت فروخت کا لگائیں، کیونکہ زکوٰۃ دینے والے کی حیثیت بائع جیسی ہے، جس کے عوض اس نے اللہ سے جنت حاصل کرنا ہے قرآن مجید میں ہے: ﴿إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنْفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ بِآثَرٍ لَهُمْ الْجَنَّةَ﴾ (التوبہ: ۱۱) ”اللہ نے مومنوں سے ان کی جانیں اور ان کے مال خرید لئے ہیں (اور اس کے) عوض میں ان کے لئے بہشت (تیار کی) ہے۔“

خود کو کھوٹ کے شبہ سے پاک کر لینا چاہے۔ حدیث میں ہے: دُعَا مَا يَرْيَبُكَ إِلَى مَا لَا يَرْيَبُكَ (فتح الباری: ۲۹۳/۴) ”شبہ والی شے کو چھوڑ کر اس کو اختیار کیا جائے جس میں شبہ نہیں۔“ سلامتی کی راہ یہی ہے کہ اللہ سے کھرے مال کا سودا کیا جائے کیونکہ اس کا عوض کھرا ہے اور وہ جنت ہے جس کے اوصافِ کریمہ سے کتاب و سنت بھرا پڑا ہے۔

**سوال:** بیٹے کی پیدائش پر دوست نے سیونگ سرٹیفکیٹ (تین ہزار روپے) تحفہ دیا تو بینک میں کچھ عرصہ رقم جمع رہنے پر معلوم ہوا کہ وہ رقم تو سود کی وجہ سے بڑھ رہی ہے۔ اب اصل رقم کی بجائے سود کی زائد رقم کافی مقدار میں بڑھ چکی ہے اور رقم نکلا کر استعمال بھی کی جا چکی ہے

(۱) سود والی زائد رقم کا مصرف کیا ہوگا؟

(۲) میں نے جو رقم نکلا کر استعمال کر لی، کیا اس کا ادا کرنا ضروری ہوگا؟

(۳) کچھ عرصہ بعد سود کا بڑھنا بند کروا دیا تھا۔ رقم تو بڑھتی گئی اس کا کیا بنے گا؟

(۴) بعض حضرات کے نزدیک بینک میں رقم رکھنا ہی صحیح نہیں، گھر میں رکھیں تو رقم محفوظ نہیں، حوالہ سود کا دیتے ہیں۔ کیا کیا جائے۔ (کرنل نعیم پوری، لاہور)

**جواب: (۱)** سودی رقم کا مصرف یہ ہے کہ اگر کسی نے سودی پیسہ دینا ہے یا اس پر ظلم کی چٹی پڑی ہو تو یہ رقم وہاں صرف کردی جائے تاکہ حرام پیسہ حرام رستہ میں ہی جائے۔

(۲) استعمال شدہ رقم کو ادا کرنا ضروری ہے۔

(۳) اس کھاتہ میں سود لازماً بڑھتا رہے گا جسے کارندے کھا جائیں گے، لہذا ضروری ہے کہ سیونگ اکاؤنٹ کو تبدیل کر کے بامر مجبوری کرنٹ اکاؤنٹ میں رکھ لیں، اس کھاتے میں سود نہیں لگتا اور سودی رقم کو سودی رستہ میں ادا کر دیں۔

(۴) کرنٹ اکاؤنٹ میں رکھوائیں اور سود سے مزید حفاظت کے لئے 'بنک لاکر' استعمال کریں۔

**سوال:** مرحوم کی روح کو ایصالِ ثواب کے لئے اگر مرحوم کے گھر کے افراد وغیرہ عین برسی کے دن یا کسی اور دن ایک ہی مجلس میں ختم قرآن شریف کا اہتمام کر لیں تو اس امر کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

**جواب:** اولاد جو بھی کارِ خیر سرانجام دیتی ہے، اس کا اجر و ثواب میت تک پہنچتا رہتا ہے۔ ایصالِ ثواب کے لئے باقاعدہ مخصوص اوقات میں مجالس کا اہتمام کر کے قرآن مجید ختم کرانا کتاب و سنت سے ثابت نہیں، لہذا اس سے احتراز کرنا چاہئے۔ حدیث میں ہے "من أحدث فی أمرنا هذا ما لیس فیہو رد" (بخاری شریف) "جو دین میں اضافہ کرے، وہ مردود ہے"۔ ہاں البتہ مرحوم کے لئے دعائے خیر بکثرت ہونی چاہئے جس کے لئے کوئی وقت مقرر نہیں، ہر وقت ہو سکتی ہے، مخصوص دعا کے الفاظ یوں ہیں: ﴿رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِإِخْوَانِنَا الَّذِينَ سَبَقُونَا بِالْإِيمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِي قُلُوبِنَا غِلًا لِلَّذِينَ آمَنُوا رَبَّنَا إِنَّكَ رَءُوفٌ رَحِيمٌ﴾ (الحشر: ۱۰)

"اے ہمارے رب! ہمیں اور ہمارے بھائیوں کو بخش دے، جنہوں نے ایمان میں ہم سے سبقت کی اور جو ایمان لائے، ہمارے دلوں میں ایسے لوگوں کے لئے کوئی کینہ نہ ہونے دے۔ اے ہمارے رب! بے شک تو شفقت کرنے والا، رحم کرنے والا ہے۔"

**سوال:** میت پر پھول ڈالنے کی شرعی طور پر کیا حیثیت ہے؟

**جواب:** میت پر پھول ڈالنا کتاب و سنت اور خیر القرون کے عمل سے ثابت نہیں، اس لئے اس فعل سے اجتناب ضروری ہے۔ یہ کفار کی رسم ہے جو اہل اسلام میں سرایت کر چکی ہے۔ اعاذ باللہ منہا



## فطری نظام تخلیق، قرآن و سنت کی روشنی میں!

(۱) ﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِّنَ الْبُعْثِ فَإِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِّنْ نُطْفَةٍ ثُمَّ مِّنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِّنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ، وَنُقَرُّ فِي الْأَرْحَامِ مَا نَشَاءُ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى﴾ (الحج: ۵)

”لوگو! تم (دوبارہ) جی اٹھنے کے بارے میں شک میں ہو تو (اس بات پر غور کرو) ہم نے تمہیں (کس چیز سے) پیدا کیا؟ مٹی سے۔ پھر (تمہاری پیدائش کا سلسلہ کس طرح شروع ہوا؟) نطفہ سے۔ پھر خون کے لوتھڑے سے، پھر گوشت کی بوٹی سے (جو) شکل والی (بھی ہوتی ہے) اور بے شکل بھی۔ (یہ ہم اس لئے بتا رہے ہیں) تاکہ تم پر (اپنی ذات کی) کارفرمایاں ظاہر کر دیں۔ پھر (دیکھو) ہم جس (نطفے) کو چاہتے ہیں (کہ تکمیل تک پہنچائیں) اسے ایک مقررہ میعاد تک رحم میں ٹھہرائے رکھتے ہیں۔“

اس آیت میں انسانی پیدائش کے مراحل بیان کرنے کے بعد ﴿لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ وَنُقَرُّ فِي الْأَرْحَامِ مَا نَشَاءُ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى﴾ سے واضح طور پر معلوم ہوا کہ انسانی تخلیق کے تمام مراحل رحم میں درجہ بدرجہ ترقی کرتے ہوئے تکمیل کو پہنچتے ہیں۔ یہی ایک فطری نظام تخلیق ہے، اس کے علاوہ نلکی (ٹیوب) کا طریقہ غیر فطری ہے۔

(۲) ﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ سُلَالَةٍ مِّنْ طِينٍ، ثُمَّ جَعَلْنَاهُ نُطْفَةً فِي قَرَارٍ مَّكِينٍ، ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً، فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظَامًا فَكَسَوْنَا الْعِظَامَ لَحْمًا ثُمَّ أَنْشَأْنَاهُ خَلْقًا آخَرَ، فَتَبَارَكَ اللَّهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ﴾ (المومنون: ۱۲، ۱۳، ۱۴)

”اور (دیکھو) یہ واقعہ ہے کہ ہم نے انسان کو مٹی کے خلاصہ سے پیدا کیا، پھر ہم نے اسے ایک محفوظ جگہ نطفہ بنا کر رکھا۔ پھر ہم نے نطفے کو خون کا لوتھڑا بنا دیا۔ ہم ہی نے پھر لوتھڑے کی بوٹی بنائی، پھر بوٹی کی ہڈیاں بنائیں، پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھایا، پھر (دیکھو کس طرح) ہم نے اسے ایک دوسری ہی مخلوق بنا کر پیدا کر دیا۔ پھر (کیا ہی) بابرکت ہستی ہے اللہ (کی) تمام صناعتوں سے بہتر صناعت۔“

اس آیت میں بھی انسانی تخلیق کے مختلف مدارج و مراحل بیان کرتے ہوئے آغاز میں فرمایا: فی قرار مکین اس سے مراد رحم مادر ہے، جیسا کہ آیت (۶) میں اس کی وضاحت ملتی ہے۔ ظاہر ہے کہ

ٹیوب کو قرار یکین قرار نہیں دیا جاسکتا کیونکہ ٹیوب بدل سکتی ہے، جس سے اختلاط نسب کا قوی اندیشہ ہے۔

(۳) ﴿الَّذِي أَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهُ وَبَدَأَ خَلْقَ الْإِنْسَانِ مِنْ طِينٍ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهُ مِنْ سُلَالَةٍ مِنْ مَاءٍ مَهِينٍ ثُمَّ سَوَّاهُ وَنَفَخَ فِيهِ مِنْ رُوحِهِ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ قَلِيلًا مَّا تَشْكُرُونَ﴾ (السجدة: ۷۹ تا ۸۱)

” (وہی اللہ ہے) جس نے جو چیز بھی بنائی، خوب ہی بنائی۔ اور اس نے انسان کی پیدائش مٹی سے شروع کی، پھر اس کی نسل نچرے ہوئے حقیر پانی سے چلائی، پھر اس (کے پتلے) کو (نک سک سے) درست کیا، پھر پھونک مار کر اس میں روح پیدا کی، اور تم لوگوں کو کان، آنکھ، اور دل دیئے۔ (اس پر بھی) تم لوگ کم ہی (اس کا) شکر کرتے ہو۔“

اس آیت میں من سُلَالَةٍ من ماء مهين کا ذکر ہوا ہے یعنی کہ (اللہ نے) انسان کی نسل نچرے ہوئے حقیر پانی سے چلائی۔ اس پانی کو مصنوعی طریقے سے انسانی بدن سے کشید نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ اس کے لئے یا تو جلق کی شکل اختیار کی جائے گی جو شرعاً ممنوع ہے جیسا کہ ذیل کی آیت (۱۲) سے معلوم ہوگا، یا عزل کا طریقہ استعمال کیا جائے۔ یہ عزل بھی جائز نہیں ہے، حدیث میں اس کو موؤدۃ صغریٰ (ہلکے درجہ کا زندہ درگور کرنا) قرار دیا گیا ہے۔ قرآن مجید کی آیت ﴿وَإِذَ الْمُؤَوَّدَةُ سُئِلَتْ بِأَيِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ﴾ کے عموم سے یہ استدلال کیا جاسکتا ہے کہ یہاں موؤدۃ صغریٰ اور موؤدۃ کبریٰ دونوں مراد ہوں گی۔

(۴) ﴿أَيَحْسَبُ الْإِنْسَانُ أَنْ يُتْرَكَ سُدًى، أَلَمْ يَكْ نُطْفَعُ مِنْ مَّيِّ يَمْنَى، ثُمَّ كَانَ عَاقِبَةَ فَخْلَقٍ فَنَسُوهُ فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْأُنْثَى﴾ (القيامة: ۳۶-۳۹)

”کیا انسان نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ اس کو (بلا باز پرس) یوں ہی چھوڑ دیا جائے گا؟ کیا (ابتدا میں) وہ منی کا ایک قطرہ نہ تھا جو (عورت کے رحم میں) ٹپکایا گیا تھا، پھر وہ خون کا لوتھڑا بنا، پھر اللہ نے اسکو انسان بنایا، پھر اسکے (اعضاء) درست کئے، پھر اس سے مرد اور عورت کی دو قسمیں بنائیں“

ان آیات میں بھی رحم مادر میں منی ٹپکانے کا تذکرہ ہے کہ یہی فطری طریقہ ہے جیسا کہ سورۃ مرسلات میں واضح طور پر ارشاد ربانی ہے:

﴿أَلَمْ نَخْلُقْكُمْ مِنْ مَّاءٍ مَهِينٍ فَجَعَلْنَاهُ فِي قَرَارٍ مَكِينٍ، إِلَى قَدَرٍ مَعْلُومٍ﴾

”کیا ہم نے تمہیں ایک حقیر پانی سے پیدا نہیں کیا؟ پھر ہم نے اس کو ایک مقررہ وقت تک محفوظ جگہ ٹھہرائے رکھا۔“ (مرسلات: ۲۰، ۲۱)

(۵) ﴿فَلْيَنْظُرِ الْإِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ، خُلِقَ مِنْ مَّاءٍ دَافِقٍ، يَخْرُجُ مِنْ بَيْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَائِبِ﴾ (الطارق: ۷۵ تا ۷۷)

”پس انسان کو چاہئے کہ (اور نہیں تو اتنی ہی بات کو) دیکھے کہ وہ کس چیز سے پیدا کیا گیا ہے۔ وہ



پیدا کیا گیا ہے ایک اُچھلنے والے پانی سے جو ریڑھ اور سینے کی ہڈیوں کے درمیان سے نکلتا ہے۔“  
اس آیت میں محل استدلال ﴿مِنْ مَّاءٍ دَافِقٍ﴾ ہے۔ یہی فطری اور صحیح شکل ہے۔ نکی ٹیوب کی صورت میں ’دفع‘ کا فقدان ہوگا۔ لذتِ مباشرت ایک فطری تقاضا ہے، اسی کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے۔ ٹیوب میں یہ بات کہاں؟

(۶) ﴿خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَأَنْزَلَ لَكُمْ مِنَ الْأَنْعَامِ ثَمَانِيَةَ أَزْوَاجٍ، يَخْلُقْكُمْ فِي بُطُونِ أُمَّهَاتِكُمْ خَلْقًا مِّنْ بَعْدِ خَلْقٍ فِي ظُلُمَاتٍ ثَلَاثٍ، ذَلِكُمْ اللَّهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ، فَأَنَّى تُصْرَفُونَ﴾ (الزمر: ۶)

”اسی اللہ نے تم لوگوں کو (آدم کے) تن واحد سے پیدا کیا، پھر اسی سے اس کا جوڑا بنایا اور تمہارے لئے آٹھ قسم کے مویشی پیدا کئے۔ وہی تم کو تمہاری ماؤں کے پیٹوں میں پیدا کرتا ہے (اور بتدریج) تین تاریکیوں میں ایک شکل کے بعد دوسری شکل (دیتا چلا جاتا ہے) یہی اللہ تو تمہارا رب ہے۔ بادشاہی اسی کی ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ پھر تم لوگ (حق سے) کدھر پھرے جا رہے ہو؟“

اس آیت میں محل استدلال یہ کلمات ہیں: يَخْلُقْكُمْ فِي بُطُونِ أُمَّهَاتِكُمْ خَلْقًا مِّنْ بَعْدِ خَلْقٍ فِي ظُلُمَاتٍ ثَلَاثٍ، یعنی انسان اپنی ماں کے پیٹ میں پرورش پاتا ہے اور خلق بعد خلق، سے مراد یہ ہے کہ نطفہ سے لے کر مکمل انسانی شکل اختیار کرنے تک تمام مراحل تخلیق ماں کے پیٹ ہی میں طے پاتے ہیں۔ لیکن ٹیوب کی صورت میں چند ہفتے یا چند ماہ تخلیق کا ایک مرحلہ ماں کے پیٹ سے باہر طے ہوگا۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک غیر فطری بلکہ غیر شرعی طریقہ ہوگا۔

(۷) ﴿وَكَيْفَ تَأْخُذُونَهُ وَقَدْ أَفْضَىٰ بَعْضُكُم إِلَىٰ بَعْضٍ وَأَخَذْنَ مِنْكُم مِّيثَاقًا غَلِيظًا﴾ (النساء: ۲۱)

”اور تم اسے کیسے واپس لے سکتے ہو، جب کہ تم ایک دوسرے کے ساتھ صحبت کر چکے ہو۔ اور وہ تم سے (نکاح کے وقت مہر و نفقہ کا) پکا قول لے چکی ہیں۔“

محل استدلال یہ جملہ ہے: وَقَدْ أَفْضَىٰ بَعْضُكُم إِلَىٰ بَعْضٍ، اس آیت میں براہِ راست جنسی تعلق کا ذکر کیا گیا ہے جو ایک فطری امر ہے۔ لہذا براہِ راست جنسی تعلق کے علاوہ کوئی بھی طریقہ غیر فطری تصور ہوگا۔

(۸) ﴿يَسْأَلُكُمْ حَرَّتُ لَكُمْ فَأَنْتُوا حَرَّتْكُمْ أَنِّي شِئْتُكُمْ﴾ (البقرة: ۲۲۳)

”تمہاری بیویاں (گویا) تمہاری کھیتیاں ہیں، تم اپنی بھیتی میں جس طرح چاہو جاؤ۔“

اس آیت میں بھی براہِ راست مباشرت کی طرف رہنمائی کی گئی ہے، اس آیت کی بنیاد پر جس طرح عورت کے ساتھ لواطت غیر فطری فعل ہوگا، اور حرام ٹھہرایا جائے گا اسی طرح ’ٹیسٹ ٹیوب بے بی‘ کے

طریقہ کار کو بھی غیر فطری ہونے کی بنا پر حرام قرار دیا جائے گا۔

(۹) ﴿فَالآنَ بَاشِرُوهُنَّ، وَابْتَغُوا مَا كَتَبَ اللَّهُ لَكُمْ﴾ (البقرہ: ۱۸۷)

”سواب روزوں میں (رات کے وقت) ان سے ہم بستر ہو سکتے ہو، اور جو کچھ اللہ نے تمہارے لئے لکھ دیا ہے، اس (کے حاصل کرنے) کی خواہش کرو۔“

یہاں بھی طلبِ اولاد کو براہِ راست مباشرت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اور طلبِ اولاد کے لئے مباشرت کو لازمی قرار دیا گیا ہے کیونکہ باشر وھن امر کا صیغہ ہے جو اپنے اصلی استعمال کے لحاظ سے وجوب پر دلالت کرتا ہے۔

(۱۰) ﴿وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجًا لِتَسْكُنُوا إِلَيْهَا، وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَوَدَّةً وَرَحْمَةً﴾ (الروم: ۲۱)

”اور اس کی (قدرت) کی نشانیوں میں سے (ایک یہ بھی) ہے کہ اس نے تمہارے لئے تمہاری جنس سے بیویاں پیدا کیں تاکہ تم ان سے سکون حاصل کرو اور اس نے تم (میاں بیوی) کے درمیان محبت و ہمدردی پیدا کر دی۔“

رشتہ ازدواج کے مقاصد بیان کرتے ہوئے بیوی کو سکون کا ذریعہ اور شادی کو باہمی الفت و محبت کے قیام کا باعث قرار دیا گیا ہے۔ لیکن ٹیوب کا طریقہ جب عام رائج ہو جائے تو محبت و الفت کا یہ تعلق ختم ہو جائے گا۔

(۱۱) ﴿هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ وَجَعَلَ مِنْهَا رُجُومًا لِتَسْكُنَ إِلَيْهَا فَلَمَّا تَغَشَّاهَا حَمَلَتْ حَمْلًا خَفِيفًا فَمَرَّتْ بِهِ.....الآیۃ﴾ (الاعراف: ۱۸۹)

”اور وہ (اللہ) ہی ہے جس نے تمہیں تن واحد سے پیدا کیا، اور اس کی جنس سے اس کا جوڑا بنایا، تاکہ وہ اس کے پاس سکون حاصل کرے۔ پھر جب مرد نے عورت کو ڈھانپ لیا تو عورت کو ہلکا سا حمل رہ گیا۔ پھر وہ اسے لئے چلتی پھرتی رہی۔“

فلما تغشّھا حملت حملاً خفیفا سے ظاہر ہوا کہ فطری طریقہ یہی ہے کہ بیوی کے ساتھ براہِ راست جنسی تعلق قائم کیا جائے۔

(۱۲) ﴿وَالَّذِينَ هُمْ لِغُرُوجِهِمْ حَافِظُونَ، إِلَّا عَلَى أَزْوَاجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُومِينَ، فَمِنْ ابْتَغَىٰ وَرَاءَ ذَلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْعَادُونَ﴾ (المعارج: ۲۹، ۳۰)

”جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں، سوائے اپنی بیویوں یا اپنے لونڈیوں کے کہ (ان سے زنا شوی میں) ان پر کوئی الزام نہیں، لیکن جو اس کے علاوہ کچھ اور چاہیں تو ایسے ہی لوگ حد سے گزر جانے والے ہیں۔“

یہاں جنسی تعلق کے صرف دو طریقے بتائے گئے ہیں یعنی بیوی یا لونڈی سے اتصال کیا جائے،

اس بنیاد پر تمام طریقے لواطت، جلق، عزل سب ناجائز ہوں گے۔ اسی طرح ٹیوب کا طریقہ بھی ناجائز ہوگا، کیونکہ اس کے لئے مادہ تولید مرد سے کشید کرنے کے لئے عزل کا طریقہ اختیار کرنا پڑے گا، جو کہ ناجائز ہے اور اس کا بیان پہلے گزر چکا ہے۔

(۱۳) ﴿لَعَنَهُ اللَّهُ، وَقَالَ لَا تَخْذَنْ مِنْ عِبَادِكَ نَصِيبًا مَفْرُوضًا، وَلَا ضَلَنَّهُمْ وَلَا مَنِئِنُّهُمْ وَلَا مَرْئَهُمْ فَلْيُبَيِّتْكَ أَذَانَ الْأَنْعَامِ وَلَا مَرْئَهُمْ فَلْيَغْيِرَنَّ خَلْقَ اللَّهِ، وَمَنْ يَتَّخِذِ الشَّيْطَانَ وَلِيًّا مِنْ دُونِ اللَّهِ فَقَدْ خَسِرَ خُسْرَانًا مُبِينًا﴾ (النساء: ۱۱۸، ۱۱۹)

”جس (شیطان) پر اللہ کی لعنت ہے، اور جس نے (اللہ تعالیٰ سے) کہا تھا کہ میں تیرے بندوں سے (نذرون یا ز) کا ایک مقرر حصہ لے کر رہوں گا۔ ان کو بہکاؤں گا، ان کو آرزوؤں میں الجھاؤں گا اور انہیں حکم دوں گا، تو وہ میری ہدایت کے مطابق جانوروں کے کان چیرا کریں گے اور انہیں حکم دوں گا تو وہ (میری ہدایت کے مطابق) اللہ کی خلقت میں تبدیلی کریں گے اور جو کوئی اللہ کو چھوڑ کر شیطان کو اپنا دوست بنائے، وہ صریح گھائے میں ہے۔“

ان آیات مذکورہ کو پڑھنے کے بعد یہ اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ ان آیات میں فطری نظام تخلیق کا بیان ہے، لیکن اس سے یہ کہاں لازم آتا ہے کہ دوسرا کوئی طریقہ ناجائز ہے؟ جواب یہ ہے کہ آخری آیات میں فطری نظام تخلیق تبدیل کرنے کو شیطانی طریقہ قرار دیا گیا ہے۔ آیت کے الفاظ ﴿وَلَا مَرْئَهُمْ فَلْيَغْيِرَنَّ خَلْقَ اللَّهِ﴾ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ٹیوب کا یہ طریقہ محض علاج نہیں ہے بلکہ فطری نظام تخلیق کے مقابلہ میں شیطانی طریق کار ہے، جس کے مفاسد زیادہ اور منافع کم ہیں۔ علماء اصول کا ایک مشہور ضابطہ ہے کہ درء المفاسد مقدم علی جلب المنافع یعنی مفاسد (خراہیوں) کو دور کرنا، منافع کے حصول پر مقدم ہے۔ اس بنا پر اس طریق کار کے جواز کا فتویٰ نہیں دیا جاسکتا۔<sup>(۱)</sup>

### ایک شبہ کا ازالہ

کہا جاسکتا ہے کہ آپریشن کے طریقہ سے بھی بچے کی پیدائش ہوتی ہے، یہ بھی تو غیر فطری طریقہ ہے اسے کیسے جائز قرار دیا جاسکتا ہے؟

جواب اس کا یہ ہے کہ آپریشن کا طریقہ وہاں اختیار کیا جاتا ہے جہاں موت کا خطرہ ہو، اور طبعی طور پر بچے کی پیدائش ناممکن ہو۔ ظاہر ہے اس موقع پر ماں کی جان بچانے کے لئے اضطراری طور پر یہ آپریشن کیا جاتا ہے۔ حسب ذیل آیت کی بنا پر کہا جاسکتا ہے کہ اس میں کوئی گناہ نہیں ہے۔

☆ فطری طریقوں کے مقابلے میں مصنوعی طریقوں کو رواج دینے سے پرہیز کی حد تک محترم موصوف کا موقف مستحسن ہے تاہم رابطہ عالم اسلامی، مکہ مکرمہ کی طرف سے ٹیسٹ ٹیوب بے بی کی متنوع صورتوں کے بارے میں سوالات کے جواب میں ادارہ محدث کا موقف تفصیل کے ساتھ محدث جلد ۱۸، عدد ۴ میں شائع ہو چکا ہے جسے مولانا عبدالرحمن کیلانیؒ نے علماء کے ایک علمی مباحثہ کے بعد ترتیب دیا تھا۔ وضاحت فتویٰ کے لئے اسے دیکھ لینا مناسب ہوگا۔ (ادارہ)

﴿فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ﴾ (البقرة: ۱۷۳)

”البتہ جو شخص بے قرار ہو جائے لیکن وہ حکم عدولی کرنے والا نہ ہو، اور نہ حد ضرورت سے تجاوز کرنے والا ہو تو اس پر کچھ گناہ نہیں ہے۔“

جان بچانے کے لئے آپریشن کا طریقہ اختیار کرنے پر ٹیسٹ ٹیوب بے بی، کو قیاس نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ اولاد کے حصول کو مجبوری یا اضطراری حالت قرار نہیں دیا جاسکتا۔

ایسا بانجھ شخص علاج کے دوسرے طریقے اختیار کر سکتا ہے، لیکن جدید طریقہ حرام کاری کا ذریعہ بن سکتا ہے، اس لئے ایک مومن اس کے جواز کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ اس طریقہ کو جائز قرار دینے کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم نے انسان کو حیوانات کے درجہ تک گرا دیا ہے۔ اس صورت میں یقیناً ہم اس آیت کے مصداق ٹھہریں گے:

﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِينَ﴾ (التین: ۵، ۴)

”بیشک ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا پھر اسے نیچی سے نیچی حالت کی طرف پھیر دیا۔“ اس معکوس ترقی سے کون بچ سکتے ہیں؟ فرمایا:

﴿إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ﴾ (التین: ۶)

”مگر وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل (بھی) کئے،“

یہاں بطور شاہد کے اس حدیث کو ذکر کر دینا بھی مناسب ہوگا جس میں ایسے شخص پر لعنت فرمائی گئی ہے جو اللہ تعالیٰ کے تخلیقی نظام کو تبدیل کرتا ہے۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

لعن الله الواشمات والمؤتشمات والمتنمصات والمتفلجات للحسن، المغيرات خلق الله (صحیح بخاری، نمبر ۴۸۸۶، کتاب التفسیر، سورۃ الحشر)

”اللہ تعالیٰ نے لعنت کی ہے: (۱) گوندنے والی، (۲) گدوانے والی، (۳) چہرہ کے بال اکھاڑنے والی، (۴) خوبصورتی کے لئیدانتوں کے درمیان سوراخ کرنے والی، اللہ تعالیٰ کی تخلیق (ساخت) کو بدلنے والی عورتوں پر۔“

اسی طرح حضرت عبد اللہ بن عمرؓ سے روایت ہے

”اللہ تعالیٰ نے لعنت کی بال ملانے والی پر، بال ملوانے والی پر اور گوندنے والی اور گوندوانے والی پر، یعنی اصل بالوں پر اضافہ کرتے ہوئے مصنوعی بال لگانے والی عورت ملعون ہے۔“

ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو جس ساخت پر پیدا کیا ہے اس میں تغیر و تبدل جائز نہیں ہے۔ یہ تبدیلی وہیں ہو سکتی ہے جہاں شرعی طور پر کوئی جواز نکلتا ہو۔ یہی معاملہ فطری نظام تخلیق کا ہے کہ اس میں تغیر جائز نہیں ہے۔

## ایک اور اشکال

قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ جس آدمی نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دی ہوں، وہ اس کے لئے حلال نہیں ہو سکتی تا وقتیکہ کوئی دوسرا آدمی اس سے نکاح نہ کر لے اور پھر اسے اپنی مرضی سے طلاق دے دے، تو اس طرح سے وہ پہلے شوہر کے نکاح میں آ سکتی ہے جیسا کہ فرمایا ﴿حَتَّىٰ تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ﴾..... اور حدیث میں ارشادِ نبوی ہے کہ محض نکاح (عقد) کافی نہیں ہے بلکہ لذتِ جماع کا حصول بھی ضروری ہے۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں

حتى يذوق من عسيلتها كما ذاق الأول (تفسیر ابن کثیر: ۲/۷۸۱ بحوالہ بخاری، مسلم)

”دوسرا خاوند اسی طرح اس سے لذتِ جماع حاصل کر لے جس طرح پہلے خاوند نے کیا تھا۔“

یہاں قابلِ غور بات یہ ہے کہ اگر ٹیوب میں ایسی عورت کا بیضہ اور مرد کا مادہ تولید جمع ہو جائے یعنی شوہر ثانی کے مادہ تولید کا تجربہ ناکام ہو جائے یعنی کوئی اولاد نہ ہو تو کیا عورت اپنے پہلے شوہر سے دوبارہ نکاح کر سکتی ہے یا اس کے لئے اس حدیث میں ہی فطری نظام تخلیق کی طرف رہنمائی کی گئی ہے۔ اس بنا پر ختم ریزی کا عمل شیطانی طریقہ کار ہوگا۔☆☆

## رویتِ ہلال اور مطالع کا اختلاف

رویتِ ہلال کا مسئلہ ان چند مسائل میں سے ہے جن سے عامۃ المسلمین اکثر متاثر ہوتے ہیں اور علم نہ ہونے کی بنا پر اہل علم کے متعلق مختلف شبہات بھی پیدا کرتے رہتے ہیں۔ رویتِ ہلال کا مسئلہ جہاں رویت یا شہادت سے تعلق رکھتا ہے، وہاں اس مسئلہ کا ’قضا‘ سے بھی گہرا تعلق ہے جو شہادتیں وصول کر کے ان کے معتبر ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ کرتی ہے۔ مزید برآں اس مسئلے میں مسلمانوں کی اجتماعیت کی واضح رعایت بھی موجود ہے۔

اسی طرح اختلافِ مطالع کی بنا پر تمام مسلمان ایک مخصوص فاصلے تک ہی ایک رویت کی پابندی کر سکتے ہیں، اور یہ خواہش شرعی لحاظ سے کوئی درجہ استناد نہیں رکھتی کہ دنیا بھر کے تمام مسلمان ایک ہی روز عید منائیں۔ جس طرح دنیا بھر میں نمازوں کا وقت ایک نہیں ہو سکتا بلکہ سورج کے طلوع و غروب کے اوقات مختلف ہونے کی وجہ ہر علاقے کے لوگوں کے اوقات قدرے مختلف ہوتے ہیں، اسی طرح چاند کے طلوع و غروب میں واقعاتی فرق کی بنا پر رمضان، عید الفطر اور عید الاضحیٰ وغیرہ میں بھی فرق لایا جاتا ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ اسلامی حکومتوں میں رویتِ ہلال پر توجہ دینے کا شعور پیدا کیا جائے اور عوام کو بھی اس شرعی امر کی اہمیت کا احساس ہونا چاہئے، بطور شاہد اپنی ذمہ داری کا اور رویتِ ہلال کی انتظامیہ تک پہنچانے کا۔ اس موضوع کے مختلف پہلوؤں پر محدث میں پہلے بھی علمی مباحث شائع ہو چکے ہیں، جن کی فہرست مقالہ کے آخر میں دی گئی ہے، جبکہ زیرِ نظر مضمون میں بھی رویتِ ہلال کے ان تصورات پر ایک جامع بحث موجود ہے۔ (حسن مدنی)

﴿يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْآهَةِ قُلْ هِيَ مَوَاقِيتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ﴾ (البقرہ: ۱۸۹)

”آپ سے ہلالوں (چاند) کے بارے میں پوچھتے ہیں، کہہ دیجئے کہ وہ لوگوں کے لئے اوقات (معلوم کرنے) کا ذریعہ ہیں اور حج کے لئے۔“

### کواکب

علمِ ہیئت میں یہ بات مسلمہ ہے کہ کواکب میں سے بعض سیارے ایسے ہیں جو آسمان میں گردش کرتے ہیں اور بعض ایسے ہیں جو گردش نہیں کرتے بلکہ اپنی جگہ پر ثابت ہیں۔ گردش کرنے والے کواکب کی تعداد سات ہے: (۱) زحل (۲) مشتری (۳) مریخ (۴) شمس (۵) زہرہ (۶) عطارد (۷) قمر شمس اور قمر کے ماسوا باقی پانچ کواکب کو خُنَس، جَوَّار، کُنَس کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس بحث کا تعلق دراصل علمِ الافلاک سے ہے جس کا ہمارے موضوع سے تعلق نہیں۔ صرف اتنا بتانا مقصود ہے کہ علمِ الافلاک کے ماہرین کا یہ نظریہ ہے کہ قمر بھی دوسرے سیاروں کی طرح آسمان میں گردش کرتا ہے

اور ﴿كُلُّ فِیْ فَلَاکِ یَسْبَحُونَ﴾ کی آیت بھی بتا رہی ہے کہ سورج چاند وغیرہ آسمان میں تیر رہے ہیں۔

## ہلال اور قمر

’ہلال‘ واحد ہے اَھْلَہ کی۔ پہلی یا دوسری رات کا چاند ہو تو اسے ’ہلال‘ کہا جاتا ہے۔ ابو یوسف کا قول ہے کہ مہینہ کے آخری دو رات کے چاند کو بھی ’ہلال‘ کہا جاتا ہے جبکہ نصف ماہ کے چاند پر ’قمر‘ کا اطلاق ہوتا ہے۔

**ہلال نام کی وجہ:** لہذا پہلی اور دوسری تاریخ کے چاند کو ’ہلال‘ اس لئے کہا جاتا ہے کہ چاند نظر آنے پر بغرض اطلاع لوگ آواز بلند کرتے ہیں۔ ہلال کا لغوی معنی آواز بلند کرنا ہے، کہا جاتا ہے: استھل الصبی حین یولد یعنی ”پیدائش کے وقت بچہ نے آواز بلند کی“

## یوم

رات دن کے مجموعہ کا نام ’یوم‘ ہے۔ عربوں کے نزدیک یہ دورانیہ غروب آفتاب سے غروب آفتاب تک ہے۔ اہل روم اور اہل فارس کے نزدیک طلوع آفتاب سے طلوع آفتاب تک ہے۔ فرق یہ ہے کہ عربوں کے نزدیک رات پہلے اور دن بعد میں اور اہل روم، اور اہل فارس کے نزدیک دن پہلے اور رات بعد میں آتی ہے۔

## چاند کا بتدریج بڑا ہونا اور کم ہونا

پہلی تاریخ کو چاند چھوٹا ہوتا ہے، روشنی بھی کم ہوتی ہے۔ پھر بتدریج بڑا ہوتا جاتا اور روشنی بھی زیادہ ہوتی جاتی ہے۔ چودھویں رات تک چاند تکمیل کو پہنچ جاتا ہے۔ پھر پندرہویں رات سے گھٹنا شروع ہو جاتا ہے۔ آخر میں کھجور کی ٹہنی جیسا ہو جاتا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے

﴿وَالْقَمَرَ قَدَرْنَا مَنَازِلَ حَتَّىٰ عَادَ كَالْعُرْجُونِ الْقَدِيمِ﴾ (سورۃ یسین: ۳۹)

”چاند کے لئے اس کی منزلوں کا ہم نے اندازہ لگایا ہے۔ حتیٰ کہ وہ اپنی منزل طے کرتا ہوا کھجور کی پرانی ٹہنی جیسا ہو جاتا ہے“

چاند کا یہ چکر ایک مہینہ میں پورا ہوتا ہے اور سال میں بارہ چکر ہوتے ہیں۔

## آیت کا شان نزول

حضرت ابن عباسؓ نے بیان کیا کہ معاذ بن جبلؓ اور ثعلبہؓ دونوں نے آنحضرت ﷺ سے دریافت کیا کہ شروع میں جب چاند نکلتا ہے تو دھاگے کی طرح باریک ہوتا ہے۔ پھر بتدریج بڑھتے بڑھتے گول ہو جاتا ہے، پھر بتدریج گھٹتا گھٹتا پہلی حالت پر لوٹ آتا ہے۔ سورج کی طرح یہ ایک حالت پر کیوں نہیں



رہتا؟ جواب میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی ﴿يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْآهْلِ قُلْ هِيَ مَوَاقِيتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ﴾ ”یعنی چاند کے بڑا چھوٹا ہونے کے بارے میں سوال کرتے ہیں، کہہ دیجئے: یہ لوگوں کیلئے اور حج کے لئے اوقات ہیں۔“ یہ آیت بتاتی ہے کہ چاند کا بڑا چھوٹا ہونا، اوقات معلوم کرنے کا ذریعہ ہے۔

### مہینے کے دن

قمری مہینے تیس دن کے بھی ہوتے ہیں اور انتیس کے بھی، لیکن زیادہ انتیس دن کے ہوتے ہیں۔ حضرت ابن مسعودؓ فرماتے ہیں: مَا صُمْتُ مَعَ النَّبِيِّ ﷺ تِسْعًا وَعَشْرِينَ أَكْثَرَ مِمَّا صُمْنَا ثَلَاثِينَ ”میں نے رسول اللہ ﷺ کی معیت میں جتنے ماہ روزے رکھے ہیں، ان میں انتیس دن والے مہینے تیس دن والے مہینوں کی نسبت زیادہ تھے۔“ (ترمذی)

بخاری کی ایک اور روایت میں ہے: الشَّهْرُ هَكَذَا وَهَكَذَا وَخَنَسَ الْإِبْهَامُ فِي الثَّلَاثَةِ ”رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مہینہ اتنے (دس دن)، اتنے (دس دن) دن کا ہے۔ تیسری مرتبہ انگوٹھے کو نیچے کر لیا یعنی نو دن۔ کل انتیس دن کا ہے۔“ اس سے یا تو یہ بتانا مقصود تھا کہ ماہ رواں انتیس دن کا ہے یا یہ کہ مہینہ انتیس دن کا بھی ہوتا ہے۔ ایک دوسری روایت میں الفاظ یوں ہیں: الشَّهْرُ يَكُونُ تِسْعَةً وَعَشْرِينَ وَيَكُونُ ثَلَاثِينَ ”مہینہ انتیس دن کا بھی ہوتا ہے اور تیس دن کا بھی۔“

### انتیس دن والے مہینے

حافظ ابن حجرؒ نے بعض حفاظ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نو برس روزے رکھے ہیں، ان میں دو رمضان تیس تیس دن کے تھے..... امام نووی نے بیان کیا ہے کہ پے در پے دو، تین یا چار مہینے انتیس دن کے ہوتے ہیں۔ مسلسل چار سے زیادہ مہینے انتیس دن کے نہیں ہوتے۔

### قمری مہینے طبعی اور فطرتی ہیں

قمری مہینے کا آغاز اور اس کی انتہا رؤیت ہلال پر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قمری مہینے طبعی اور فطرتی ہیں۔ مہینہ کا انتیس یا تیس دن کا ہونا، یہ اختلاف بھی طبعی ہے۔

### حسی علامت

چاند بذاتِ خود تاریخ اور مہینہ کے لئے حسی علامت ہے۔ ہر واقف اور ناواقف چاند دیکھ کر تاریخ اور مہینہ کی ابتدا اور انتہا کا اندازہ بآسانی لگا سکتا ہے۔ اس کے برعکس سورج، مہینہ اور سال معلوم کرنے کی غیر حسی علامت ہے۔ اس سے سال اور مہینہ کا اندازہ ایک باخبر انسان تو حساب سے کر سکتا ہے مگر جو شخص

ناواقف اور بے علم ہے، اس کے لئے مہینہ کی تاریخ اور سال سے خود بخود باخبر ہونا ایک مشکل امر ہے، اس لئے قیاس یہ چاہتا ہے کہ ابتداءً آفرینش میں لوگ چاند ہی کے مہینے جانتے تھے اور بارہ مہینوں کا سال شمار کرتے تھے۔ چنانچہ تقویم تاریخی کے مصنفین میں سے بعض نے لکھا ہے:

”قمری سال حقیقی ہے یعنی چاند کے بارہ مرتبہ عروج و زوال کو ایک سال شمار کیا جاتا ہے۔ اس میں موسم کا کوئی لحاظ نہیں، کبھی یہ سال سردیوں سے شروع ہوتا ہے اور کبھی گرمیوں میں، کبھی بہار میں اور کبھی خزاں میں۔ چاند زمین کے گرد چکر لگاتا ہے، وہ دائرہ جس پر چاند زمین کے گرد چکر لگاتا ہے، بالکل گول نہیں ہے۔ اس لئے چاند کبھی زمین سے قریب تر ہوتا ہے اور کبھی بعید تر۔ اسی طرح چاند کی رفتار ہر جگہ برابر نہیں ہوتی، کبھی تیز ہوتی ہے کبھی سست۔ اس لئے زمین کے گرد چاند کا چکر کبھی تیس دن میں مکمل ہوتا ہے اور کبھی انتیس دن میں۔ اسی طرح چاند کے مہینے انتیس دن کے ہوتے ہیں اور کبھی تیس دن کے۔ زمین کے گرد چاند کے بارہ چکروں کی مجموعی مدت قریباً تین سو چون دن ہوتی ہے، اس لئے ہر قمری سال اتنی ہی مدت کا ہوتا ہے۔ اس میں کسی حسابی کے زحمت اٹھانے کی ضرورت نہیں۔ کسی ایک مقام پر تیرہویں بار چاند اس سے کم مدت میں نظر آ ہی نہیں سکتا۔ یہ تو ممکن ہے کہ مطلع غبار آلود ہو یا بادل چھائے ہوں تو چاند وقت پر نظر نہ آئے لیکن یہ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ اس سے کم مدت میں چاند نظر آ جائے۔ (تقویم تاریخی، مرتبہ: ہاشمی)

ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿إِنَّ عِدَّةَ الشُّهُورِ عِنْدَ اللَّهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِي كِتَابِ اللَّهِ يَوْمَ

خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ مِنْهَا أَرْبَعَةٌ حُرْمٌ ذَلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ﴾ (التوبہ: ۳۷)

”اللہ تعالیٰ کے نزدیک مہینوں کی تعداد بارہ ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی کتاب میں اس دن سے مقرر ہیں جب سے اس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے۔ ان میں سے چار مہینے حرمت کے ہیں۔ یہی دینِ قیّم ہے۔“

### رؤیت اور شہادت

احادیث میں یہ بات واضح ہے کہ روزہ رکھنے اور افطار کرنے کا انحصار رؤیتِ ہلال پر ہے۔ دیکھے بغیر نہ روزہ رکھا جائے اور نہ افطار یعنی ترک کیا جائے، حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے:

صوموا لرؤیتہ وأفطروا لرؤیتہ فان غُمي عليكم فأكملوا عدة شعبان ثلاثين  
”چاند دیکھ کر روزہ رکھو اور چاند دیکھ کر افطار کرو، اگر چاند پوشیدہ ہو جائے تو شعبان کی گنتی تیس دن پوری کرو۔“ (منتقى)

اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے علامہ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں:

”لیس المراد به أنه لا يصومه أحد حتى يراه بنفسه یعنی اس حدیث کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ کوئی شخص خود چاند دیکھے بغیر روزہ نہ رکھے بلکہ اس حدیث کا یہ معنی ہے کہ لا يصومه

أحد حتی یراہ أویراہ غیرہ یعنی ”کوئی شخص روزہ نہ رکھے جب تک خود چاند نہ دیکھ لے یا کوئی دوسرا معتبر آدمی چاند نہ دیکھ لے۔ اگر حدیث کا یہ مفہوم ہو کہ جو شخص چاند دیکھے وہی روزہ رکھے تو ناپینا یا وہ شخص جو نگاہ کی کمزوری کی بنا پر چاند نہیں دیکھ سکتا، وہ روزہ رکھنے کا مکلف نہیں ہوگا جبکہ ﴿فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ﴾ والی آیت کا تقاضا ہے کہ وہ روزہ رکھے۔“

مختصر یہ کہ جن کو چاند نظر نہ آئے، شہادت ملنے سے روزہ اور افطار ان پر لازم ہو جاتا ہے۔ اگر مطاع ابر آلود ہو یا غبار کی وجہ سے چاند نظر نہیں آیا تو پھر شعبان کے تیس دن پورے کرنے کی ہدایت ہے جیسا کہ حدیث کے الفاظ سے ظاہر ہے: فَأَكْمَلُوا عِدَّةَ شَعْبَانَ ثَلَاثِينَ

## نصابِ شہادت

**ہلالِ رمضان کی شہادت:** جمہور ائمہ کا قول ہے کہ رمضان کے بارے میں ایک عادل مسلمان کی شہادت کافی ہے۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے ایک شخص کی شہادت پر روزہ رکھا اور دوسروں کو روزہ رکھنے کا حکم دیا۔ نیز ابن عمرؓ نے بیان کیا کہ فَأَخْبَرَتِ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنِّي رَأَيْتُهُ فَصَامَ وَأَمَرَ النَّاسَ بِصِيَامِهِ (ابوداؤد)

”میں نے نبی ﷺ کو خبر دی کہ میں نے چاند دیکھا ہے تو آپ نے روزہ رکھا اور لوگوں کو بھی روزہ رکھنے کا حکم دیا۔“ (اس حدیث کو ابن حبان اور حاکم نے صحیح کہا ہے)

(۲) حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ ایک اعرابی نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آ کر بیان کیا کہ میں نے رمضان کا چاند دیکھا ہے۔ آپؐ نے اس سے پوچھا: کیا تو کلمہ توحید اور رسالت کی شہادت دیتا ہے۔ اس نے اعتراف کیا، آپؐ نے حضرت بلالؓ کو حکم دیا کہ وہ اعلان کرے کہ لوگ روزہ رکھیں (متفق: ج ۴ ص ۱۸۴) اس حدیث کو ابن حبان اور ابن خزیمہ نے صحیح کہا ہے۔

ہر دو احادیث سے ظاہر ہے کہ رمضان کے بارے میں ایک مسلمان عادل کی شہادت کافی ہے۔ امام نوویؒ نے بھی اس کی صحت کا اعتراف کیا ہے۔

**ہلالِ عید کی شہادت:** ہلالِ عید کی شہادت کے لئے کم از کم دو گواہوں کی ضرورت ہے۔ چنانچہ آخر رمضان میں ہلالِ عید کے متعلق جھگڑا ہوا۔ دو اعرابی آئے اور انہوں نے شہادت دی کہ بخدا ہم نے کل عید کا چاند دیکھا ہے۔ رسول خدا ﷺ نے حکم دیا کہ روزہ افطار کر لیں اور صبح عید گاہ کی طرف نکلیں۔ عید کے بارے میں کوئی ایسی صحیح حدیث نہیں جس میں ایک شہادت کا ذکر ہو۔

**نصابِ شہادتِ رمضان کے بارے میں اعتراض:** امام مالکؒ، لیثؒ، اوزاعیؒ، ثوریؒ اور امام شافعیؒ سے مروی (ایک قول میں) ہے کہ ہلالِ رمضان کے لئے ایک شہادت کافی نہیں بلکہ دو کی شہادت کا اعتبار

ہوگا۔ ان ائمہ نے اپنے موقف کے بارے میں جو احادیث بیان کی ہیں، ان میں سے ایک وہ حدیث ہے جو عبدالرحمن بن زید سے مروی ہے۔ الفاظ یہ ہیں:

فَإِنْ شَهِدَ شَاهِدَانِ مُسْلِمَانِ فَصُومُوا وَافْطَرُوا (مسند احمد)  
 ”اگر دو مسلمان شہادت دیں تو روزہ رکھو اور افطار کرو“

دوسری حدیث وہ ہے جو امیر مکہ حارث بن حاطب سے مروی ہے۔ اس کے الفاظ حسب ذیل ہیں:

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: فَإِنْ لَمْ نَزِرْهُ وَشَهِدَ شَاهِدٌ عَدْلٌ نَسَكْنَا بِشَهَادَتِهِمَا (ابوداؤد)

”اگر ہم چاند نہ دیکھ پائیں اور دو عادل گواہ شہادت دے دیں تو ان کی شہادت پر شرعی احکام

یعنی روزہ عید ادا کریں گے، اور دارقطنی نے روایت کر کے اس کی سند کو متصل صحیح کہا (منشی: ۱۵۹۲)

بظاہر ان احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ہلالِ رمضان کے لئے بھی کم از کم دو گواہ ہوں۔ جن

احادیث میں ایک گواہ کا ذکر ہے، ان میں دوسرے گواہ کی نفی نہیں ہے۔ اس بات کا احتمال ہے کہ اس سے پہلے کسی دوسرے شخص سے بھی رؤیتِ ہلال کا علم ہو گیا ہو۔

**جواب:** اس اعتراض کا ابن مبارک اور امام احمد بن حنبل نے یہ جواب دیا ہے کہ جن احادیث میں دو گواہوں کی تصریح ہے، ان سے زیادہ سے زیادہ ایک شہادت سے ممانعت بالمفہوم ثابت ہوتی ہے۔ مگر ابن عمرؓ اور ابن عباسؓ ہر دو کی احادیث میں ایک شہادت کی قبولیت کا بالمنطوق بیان ہے اور مسلمہ اصول ہے کہ دلالتِ مفہوم سے دلالتِ منطوق رائج ہے۔ اس لئے یہی قول درست ہے کہ رؤیتِ ہلال کے بارے میں ایک مسلمان عادل کی شہادت کافی ہے۔

پھر یہ احتمال پیدا کرنا کہ کسی دوسرے شخص سے رؤیتِ ہلال کا علم ہو گیا ہو، شریعت کے بیشتر احکام کو معطل کر دینے کے مترادف ہے۔ البتہ عبدالرحمن اور امیر مکہ کی احادیث سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ہلالِ عید کے لئے بہر حال کم از کم دو گواہوں کی ضرورت ہے۔

## ہلالِ شعبان کی نگرانی

رمضان کی یکم تاریخ معلوم کرنے کے لئے ہلالِ شعبان کی نگرانی اور اس کا تحفظ کیا جائے۔ بروایت ابو ہریرہؓ رسول خدا ﷺ نے فرمایا: احصوا هلال شعبان لرمضان (ترمذی: رقم ۶۸۷)  
 ”رمضان کے لئے شعبان کے ہلال کا احاطہ کرو۔“

## مشکوٰۃ دن کا روزہ

چاند نظر نہ آنے کی وجہ سے یہ فیصلہ نہیں کیا جاسکتا کہ شعبان کی تیسویں تاریخ ہے یا نہیں؟ بعض لوگ احتیاط کے طور پر شکی روزہ رکھتے ہیں جس کی شریعت اجازت نہیں دیتی۔ حضرت عمارؓ نے فرمایا

من صام اليوم الذي شك فيه فقد عصى أبا القاسم عليه السلام (دار قطنی: ۱۵۷/۲)  
 ”جس شخص نے شکی دن کا روزہ رکھا، اس نے ابوالقاسم کی نافرمانی کی۔“

## شہرا عید لاینقصان

یہ حدیث کے الفاظ ہیں۔ بروایت ابو بکرہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

شہرا عید لاینقصان: رمضان و ذوالحجۃ (صحیح سنن الترمذی: رقم ۵۵۸)  
 ”عید کے دو مہینے کم نہیں ہوتے، ایک رمضان اور دوسرا ذوالحجہ“

امام احمدؒ کے نزدیک اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ ایک سال میں رمضان اور ذوالحجہ کا مہینہ دونوں ایک ساتھ کم نہیں ہوتے، اگر ایک انتیس دن کا ہے تو دوسرا تیس دن کا ہوگا۔

امام اسحاقؒ نے اس حدیث کا یہ مطلب بیان کیا ہے کہ ”اگر مہینہ انتیس دن کا ہوا تو بھی اس پر لفظ تمام کا اطلاق ہوگا، اسے نقص کی طرف منسوب نہیں کیا جائے گا۔“ یعنی امام اسحاقؒ کے قول کے مطابق دونوں مہینے ایک ساتھ کم ہو سکتے ہیں۔ اس کی وجہ سے ثواب میں کوئی کمی نہیں ہوگی۔

ابن حبانؒ نے اس حدیث کا یہ معنی بیان کیا ہے کہ ”فضیلت میں دونوں مہینے برابر ہیں، خواہ ایک مہینہ انتیس دن کا ہو، دوسرا مہینہ تیس دن کا۔“

امام نوویؒ کے نزدیک رائج معنی یہ ہے کہ ”ان کے اجر میں کمی واقع نہیں ہوگی۔“ حدیث میں ہے جو شخص رمضان کے روزے ایمان اور حصول ثواب کی غرض سے رکھتا ہے، اس کے اگلے تمام گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ یہ حدیث اپنے عموم کے اعتبار سے اس مہینہ کو بھی شامل ہے جو تیس دن کا ہے اور اس کو بھی شامل ہے جو انتیس دن کا ہو۔ فضیلت ہر دو کی یکساں ہے۔

## ٹیلیفون، ریڈیو، تار کے ذریعے شہادت

ٹیلیفون، ریڈیو اور تار یہ سب خبر رسانی کے جدید ذرائع ہیں۔ ان کے بارے میں ہماری تحقیق یہ ہے کہ جو خبر ٹیلیفون، ریڈیو کے ذریعہ موصول ہو اور یہ معلوم ہو جائے کہ خبر دہندہ مسلمان اور عادل یعنی متدین ہے تو اس طرح ملنے والی خبر کا اعتبار ہوگا۔ اگر یہ پتہ نہ چل سکے تو پھر ایسی خبر کا اعتبار نہ ہوگا۔ اس لیے کہ شریعت نے گواہ کے لئے اسلام اور اس کے عادل ہونے کی شرط لگائی ہے جیسا کہ احادیث میں بیان ہو چکا ہے۔

**تاریقی:** کے ذریعہ آنے والی خبر کا اعتبار اس لئے نہیں کہ ایک تو اس میں آواز کو کوئی دخل نہیں کہ اس سے خبر دہندہ کی پہچان ہو سکے۔ دوسری بات یہ ہے کہ درمیان میں کئی واسطے پڑتے ہیں جن کے متعلق یہ علم نہیں ہوتا کہ وہ مسلمان ہیں یا غیر مسلم، عادل ہیں یا غیر عادل، البتہ اگر مختلف مقامات سے متعدد

تاروں کے ذریعہ خبر آئے جو تو اتر کی حد کو پہنچ جائے تو اس وقت واسطہ کیسا ہی ہو، خبر معتبر ہوگی۔ تو اتر کے لئے کوئی عدد معین نہیں بلکہ جتنے عدد سے علم یقین حاصل ہو جائے، وہی تو اتر ہے۔

## مطالع کا اختلاف

مطالع کا اختلاف ایک فطرتی اور طبعی شے ہے اس لئے کہ سورج اور چاند کے طلوع کا محل آسمان ہے جو گول ہے۔ امام ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں:

﴿وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ﴾ (الرحمن) فقد قيل: هو من الحساب وقيل: بحسبان كحسبان الرحي وهو دوران الفلك فإن هذا لا خلاف فيه، بل قد دل الكتاب والسنة واجمع علماء الأمة على مثل ما عليه أهل المعرفة من أهل الحساب من أن الأفلاك مستديرة لا مسطحة“ (فتاویٰ ابن تیمیہؒ ج ۲۵، ص ۱۴۲)

”والشمس والقمر بحسبان آیت کی تفسیر کرتے ہوئے ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ بعض کے نزدیک حُسبان حساب سے ہے اور بعض کا قول ہے چکی کے گھومنے کو کہتے ہیں۔ حُسبان دورانِ فلک کا نام ہے، اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ بلکہ کتاب وسنت اور امت کے علما کا اجماع سب اسی بات کی تائید کرتے ہیں جو بات آج کے ماہرین نجوم کہہ رہے ہیں کہ افلاک گیند کی طرح گول ہیں، ان کی سطح برابر نہیں ہے۔“

نواب صدیق حسن خانؒ اسی مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

والأرض جسم كالكرة وقيل ليست بكرية الشكل وهي واقفة في الهواء بجميع جبالها وبحارها وعامرها وغامرها والهواء محيط بها من جميع جهاتها كالمخ في البيضة وبعدها من السماء متساو من جميع الجهات (ذكر صورة الأرض: ص ۶۷)

”زمین جسم ہے جو گیند کی طرح گول ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ گیند کی شکل پر نہیں۔ وہ اپنے تمام پہاڑوں، سمندروں، آباد اور بنجر زمینوں سمیت ہوا میں ٹھہری ہوئی ہے اور ہوا اس کی تمام سمتوں کو اس طرح گھیرے ہوئے ہے جس طرح انڈے کی سفیدی زردی کو محیط ہوتی ہے۔ اور آسمان سے اس کی مسافت تمام سمتوں سے برابر ہے۔ اس حالت میں سورج اور چاند کی روشنی بیک وقت زمین کو منور نہیں کر سکتی بلکہ زمین کا جو قطعہ سورج اور چاند کے سامنے ہوگا، وہ پہلے روشن ہوگا۔ اس لئے یہ حقیقت ہے کہ سورج اور چاند کے مطالع میں اختلاف ایک فطرتی اور طبعی ہے۔“

## ایک علاقہ کی رویت، دوسرے علاقہ کے لئے

رویت ہلال کے متعلق جتنے پیش آمدہ مسائل ہیں، ان میں یہ مسئلہ بڑی اہمیت کا حامل ہے کہ ایک علاقہ یا ایک ملک کی رویت دوسرے علاقہ یا ملک کے لئے معتبر ہے یا نہیں۔ اس مسئلہ کے حل کے لئے

حسب ذیل امور پر غور کرنا ضروری ہے:

- ۱۔ ملک ایک ہے، اس کے کسی ایک شہر میں دیکھا ہوا چاند تمام ملک کے لئے کافی ہے۔
- ۲۔ ایک ملک کی رؤیت دوسرے ملک کے لئے قابل قبول نہیں ہے۔
- ۳۔ مطالع کا اختلاف، رؤیت اور عدم رؤیت میں کس حد تک مؤثر ہے۔

### پہلی صورت

پہلی صورت میں عکرمہ، قاسم، سالم، احمق کا قول ہے کہ ملک کے ایک شہر میں دیکھا ہوا چاند اس ملک کے دوسرے شہر کے لئے کافی نہیں۔ امام ترمذی نے بعض اہل علم کا یہ مذہب نقل کیا ہے کہ ان لکل بلد رؤیتہم یعنی ہر شہر کے لئے ان کے اہالیان کی رؤیت کارآمد ہے۔ امام ترمذی نے انہی الفاظ سے باب باندھا ہے۔ ان ائمہ نے جس حدیث سے اپنے اس نظریہ کا استدلال کیا ہے وہ کربیب تابعی سے مروی حدیث ہے جس کو بخاری اور مسلم کے سوا ائمہ کی ایک جماعت نے تخریج کیا ہے۔ حدیث کے الفاظ حسب ذیل ہیں:

عن کربیب أن أم الفضل بعثته إلى معاوية بالشام فقال فقدمت الشام فقضيت حاجتها واستهل على رمضان وأنا بالشام فرأيت الهلال ليلة الجمعة ثم قدمت المدينة في آخر الشهر فسألني عبد الله بن عباس ثم ذكر الهلال فقال متى رأيت الهلال فقلت رأيناه ليلة الجمعة فقال أنت رأيته؟ فقلت نعم وراة الناس وصاموا وصام معاوية فقال لكننا رأيناه ليلة السبت فلا نزال نصوم حتى فكل ثلاثين أونراه فقلت ألا تكتفي برؤية معاوية وصيامه؟ فقال: لا هكذا أمرنا رسول الله ﷺ (صحیح سنن الترمذی: رقم ۵۵۹۵۵۹ نیل الاوطار شرح منہجی الاخبار)

”کربیب تابعی سے روایت ہے کہ ام الفضل نے مجھے معاویہ کی طرف ملک شام میں (کسی کام کے لئے) بھیجا، میں نے اس کام کو سرانجام دیا۔ میں ابھی شام میں ہی تھا کہ رمضان کا چاند نظر آگیا اور جمعہ کی رات کو میں نے خود چاند دیکھا۔ پھر مہینہ کے آخر میں مدینہ واپس آیا۔ ابن عباسؓ نے مجھ سے (وہاں کا حال) پوچھا۔ اس کے بعد انہوں نے چاند کا ذکر کیا۔ میں نے کہا کہ ہم نے جمعہ کی رات کو چاند دیکھا ہے۔ پوچھا: کیا تو نے خود دیکھا ہے، میں نے کہا: ہاں میں نے خود دیکھا ہے اور دوسرے لوگوں نے بھی دیکھا ہے؟ انہوں نے روزہ رکھا اور معاویہ نے بھی روزہ رکھا۔ ابن عباسؓ نے کہا کہ ہم نے تو ہفتہ کی رات چاند دیکھا ہے لہذا ہم تو روزہ رکھیں گے حتیٰ کہ تیس روزے پورے ہو جائیں یا اس سے پہلے چاند دیکھ لیں۔ میں نے کہا کہ آپؐ معاویہ کی رؤیت اور ان کے روزوں پر کتنا نہیں کرتے؟ انہوں نے جواب دیا: نہیں کیونکہ رسول خدا ﷺ نے ہم کو اس طرح



حکم دیا ہے۔“

علامہ عبدالرحمن مبارکپوریؒ نے لکھا ہے

هذا بظاھرہ يدل على أن لكل بلد رؤيتهم ولا تكفي رواية أهل بلد لأهل بلد  
آخر (تحفة الاحوذى: ج ۲، ص ۳۵) ”یہ حدیث بظاہر دلالت کرتی ہے کہ ہر علاقہ کے لئے ان کے  
باشندگان کی روایت ہے، اہل بلد کی رؤیت دوسرے اہل علاقہ کے لئے کفایت نہیں کرتی۔“

بعض ائمہ نے کریب کی اس حدیث سے یہ استدلال کیا ہے کہ رؤیت کے بارے میں ایک شہادت  
معتبر نہیں، اسی لئے تو ابن عباسؓ نے کریب کی شہادت پر عمل نہیں کیا مگر ان کا یہ استدلال اس لئے درست  
نہیں کہ حدیث سے جو بات مترشح ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ رؤیت کا حکم بعید کے حق میں ثابت نہیں ہوتا۔ اس  
بنا پر ابن عباسؓ نے کریب کی شہادت کو قبول نہیں کیا۔

**حدیث کریب اور مختلف مذاہب:** ایک شہر کی رؤیت دوسرے شہر کے لئے معتبر نہیں (نووی)

- ۱۔ اس بارے میں حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری میں لکھا ہے کہ اس میں علماء کے مختلف مذاہب ہیں  
ہر بلد کی رؤیت انہی کے لئے ہے جو وہاں کے باشندے ہیں، دوسرے بلد کے لئے نہیں ہے۔
- ۲۔ جب ایک بلد میں چاند نظر آجائے تو اس کی رؤیت تمام بلاد کے لئے لازم ہوتی ہے۔ مالکیہ کے  
نزدیک یہ مشہور مذہب ہے۔

۳۔ ملک مختلف ہیں تو ایک ملک کی رؤیت دوسرے ملک کے لئے کافی نہیں۔

- ۴۔ جن شہروں میں چاند کے طلوع ہونے کا امکان ہے، صرف بادل یا غبار چاند کے خفا کا باعث ہے،  
ایسے تمام شہروں میں سے ایک شہر میں دیکھا ہوا چاند سب شہروں میں معتبر ہے، ان کے علاوہ دیگر  
شہروں میں طلوع چاند کا حکم نافذ نہیں ہوگا، یہ قول سرخسی کا ہے۔

۵۔ ابن ماثون کا قول ہے کہ اہل بلد کی رؤیت دوسرے بلد کے لئے کفایت نہیں کرتی۔ البتہ اگر وقت  
کا حاکم کسی ثبوت کی بنا پر رؤیت ہلال کا اعلان کر دے، اس لئے کہ اس کے حق میں جملہ بلاد ایک  
ہی بلد کے حکم میں ہیں، اور اس لئے بھی کہ اس کا حکم تمام ملک میں نافذ ہے تو ایسی رؤیت جملہ بلاد  
پر مؤثر ہوگی۔

- ۶۔ اگر علاقہ کی ایک جہت پہاڑی ہے۔ دوسری میدانی تو اس صورت میں ایک جہت کی رؤیت دوسری  
جہت کے لئے کافی نہیں۔

**تبصرہ:** کریب کی اس حدیث سے یہ استدلال کرنا درست نہیں کہ ایک شہر کی رؤیت اسی شہر  
کے باشندگان کے لئے ہے، دوسرے شہروں کے لئے نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ جن

شہروں کے درمیان اتنی مسافت ہو جس قدر مدینہ اور شام کے درمیان ہے تو ان میں سے ایک شہر کی روایت دوسرے شہر کے لئے کافی نہیں۔ اگر اس سے کم مسافت ہو تو اس حدیث کی رو سے ایسے شہروں میں ایک شہر کی روایت دوسرے شہروں کے لئے کافی ہونے میں ممانعت کی کوئی دلیل نہیں۔ پھر اس معنی کی بنا صرف ابن عباسؓ کے اجتہاد پر ہے اور یہ معنی اسی وقت قابل اعتماد ہو سکتا ہے جب اجتہاد کو حجت تسلیم کر لیا جائے اور یہ ڈھکی چھپی بات نہیں کہ امتی کا اجتہاد حجت نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ جہاں اس میں صواب کا امکان ہے، وہاں خطا کا بھی احتمال ہے۔

**حدیث کریب اور امام شوکانیؒ:** امام شوکانیؒ ان تمام اقوال کا ذکر کر کے لکھتے ہیں کہ ان لوگوں کی دلیل کریب کی مذکورہ بالا حدیث ہے جس میں ہے کہ ابن عباسؓ نے اہل شام کی روایت پر عمل نہیں کیا اور انہوں نے فرمایا: ہکذا أمرنا رسول اللہ ﷺ یعنی رسالت مآبؐ نے ہم کو اسی طرح حکم دیا ہے۔ اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابن عباسؓ نے یہ بات رسول اللہ ﷺ سے سنی ہے کہ ایک علاقہ کے لوگوں کے لئے دوسرے علاقہ کی روایت پر عمل کرنا ضروری نہیں۔

لیکن امام شوکانیؒ تبصرہ فرماتے ہیں کہ کریب کی حدیث جس سے لوگوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ ایک بلد کی روایت دوسرے بلد کے لئے معتبر نہیں، دراصل ابن عباسؓ کا اپنا اجتہاد ہے جسے حجت قرار نہیں دیا سکتا۔ حجت تو مرفوع حدیث ہوتی ہے اور ابن عباسؓ نے جو یہ کہا ہے کہ ہکذا أمرنا رسول اللہ ﷺ تو اس ہکذا کا مشارالیه ان کا وہ قول ہے جس میں انہوں نے بیان کیا: فلانزال نصوصم حتی نكمل ثلاثین ”ہم روزے رکھتے ہی رہیں گے حتیٰ کہ تیس پورے کریں“۔ اور ابن عباسؓ کا یہ قول دراصل رسول خدا ﷺ کے اس حکم کی روشنی میں ہے جس کو بخاریؒ اور مسلمؒ نے ان الفاظ سے روایت کیا ہے

لاتصوموا حتی تروا لہلال ولا تفطروہ حتی تروہ فإن غم علیکم فاکملوا  
العدۃ ثلاثین یعنی ”چاند دیکھے بغیر نہ روزے رکھو اور نہ دیکھے بغیر افطار کرو۔ اگر بادل یا غبار کی وجہ سے چاند پوشیدہ ہو تو پھر تیس روزے پورے کرو“

امام شوکانیؒ فرماتے ہیں کہ رسول خدا ﷺ کا یہ حکم کسی ایک علاقہ کے لئے مخصوص نہیں بلکہ اس حکم کا مخاطب ہر وہ مسلمان ہے جو اس کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس لئے حدیث سے یہ استدلال کرنا زیادہ واضح ہے کہ ایک اہل بلد کی روایت دوسرے اہل بلد کے لئے معتبر ہے۔ بہ نسبت اس استدلال کے کہ ایک اہل بلد کی روایت دوسرے اہل بلد کے لئے قابل قبول نہیں۔ امام شوکانیؒ نے اس کی یہ وجہ بھی بیان کی ہے کہ جب کسی علاقہ کے لوگوں نے چاند دیکھا ہے تو گویا مسلمانوں نے چاند دیکھا ہے چنانچہ جو بات چاند دیکھنے والے مسلمانوں پر لازم آتی ہے، وہی دوسرے مسلمانوں پر لازم آتی ہے۔

اگر ابن عباسؓ کے کلام میں اشارہ کو اس طرف متوجہ کر لیا جائے کہ ایک اہل بلد کی رویت دوسرے اہل بلد کے لئے قابل عمل نہیں تو پھر اس مفہوم کو عقلی دلیل کے ساتھ مقید کرنا پڑے گا۔ یعنی اگر ہر دو شہروں کے درمیان اتنی لمبی مسافت ہے کہ اس سے ہر دو شہروں کا مطلع اتنا مختلف ہو جاتا ہے کہ اس سے تاریخ بدل جانے کا احتمال ہے تو اس صورت میں ایک بلد کی رویت دوسرے بلد کے لئے کافی نہیں۔

### اہل شام کی رویت

اگر یہ کہا جائے کہ ابن عباسؓ نے اہل شام کی رویت پر عمل نہیں کیا حالانکہ شام اور مدینہ کے درمیان اتنا بعد نہیں کہ اس کی وجہ سے ان کے درمیانی مطلع کا کوئی زیادہ اختلاف ہو۔ تو جواب میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ کا حضرت معاویہ کی رویت اور ان کے روزوں پر اکتفا نہ کرنا، ان کا اجتہادی عمل ہے جو مرفوع حدیث کے مقابلہ میں حجت نہیں بن سکتا۔ نیز اس حقیقت سے انکار نہیں ہو سکتا کہ جمیع احکام شرعیہ میں قرب و بعد کے لحاظ کے باوجود لوگ ایک دوسرے کی شہادت کو قبول کرتے ہیں۔ رویت ہلال کا مسئلہ بھی احکام شرعیہ میں داخل ہے۔ اس کے قابل اعتماد ہونے میں کون سی رکاوٹ ہے۔

امام شوکانیؒ بحث کرتے ہوئے آخر میں فرماتے ہیں:

”اگر ہکذا کا مشار الیہ ابن عباسؓ کے اس اجتہاد کو قرار دیا جائے تو زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ جن شہروں کے درمیان اتنی مسافت ہے جتنی مسافت شام اور مدینہ کے درمیان ہے تو ان میں ایک شہر کی رویت دوسرے شہر کے لئے کافی نہیں ہوگی۔ مگر جن شہروں کی مسافت اس سے کم ہے، ان پر اس حکم کا اطلاق نہیں ہوگا۔ آخر میں انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے حضرت معاویہؓ کی رویت پر جو عمل نہیں کیا، اس میں کوئی اور حکمت ہوگی جس کا ہمیں علم نہیں۔“

**امام شوکانیؒ کا فیصلہ:** رویت ہلال کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے امام شوکانیؒ لکھتے ہیں:

والذی ینبغی اعتمادہ هو ما ذهب إلیہ المالکیہ وجماعۃ من الزیدیۃ واختارہ المہدی منهم وحکاه القرطبی عن شیوخہ أنه إذا راہ أهل بلد لزم أهل البلاد کلہا (نیل الاوطار: ج ۴، ص ۱۹۴) ”رویت ہلال کے بارے میں قابل اعتماد وہی بات ہے جو مالکیہ اور زیدیہ کی ایک جماعت نے اختیار کی ہے۔ مہدی نے ان سے اور قرطبی نے اپنے شیوخ سے نقل کیا ہے کہ جب ایک اہل بلد چاند کو دیکھ لیں تو تمام اہل بلاد پر اس کا اعتبار لازم ہو جاتا ہے“

### شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کی رائے

رویت ہلال کی بحث کے وقت ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے شیخ الاسلام نے فرمایا کہ ”جو لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ایک بلد کی رویت جمیع بلاد کے لئے نہیں ہے جیسا کہ اکثر اصحاب

شافعی کا قول ہے کہ مسافتِ قصر کی حد تک بلاد میں، ایک بلد کی رویت دوسرے بلاد کے لئے کافی ہے اور جو بلاد مسافتِ قصر کی حد سے باہر ہیں، ان کے لئے کافی نہیں۔ اور ان میں سے بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ ایک ملک کی رویت دوسرے ملک کے لئے کافی نہیں۔ انہوں نے ہر دو نظریوں کو ضعیف قرار دیا ہے اور وجہ یہ بیان کی ہے کہ طلوعِ ہلال کا مسافتِ قصر سے کوئی تعلق نہیں اور دو ملکوں کا الگ الگ ہونا بھی ایک دوسرے کے لئے رویت کے ناکافی ہونے کا باعث نہیں۔“

**دوسری وجہ:** ان ہر دو نظریوں کے غلط ہونے کی جو دوسری وجہ بیان کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ اگر رویتِ ہلال کے لئے مسافتِ قصر کو یا ملک کے مختلف ہونے کو حد تصور کر لیا جائے تو اس سے یہ لازم آتا ہے کہ جو شخص مسافتِ قصر کی حد کے اندر یا ملک کے آخری کنارہ پر ہوگا، وہ تو روزہ رکھنے اور عید کرنے کا پابند ہوگا لیکن جو شخص مسافتِ قصر سے تھوڑے فاصلے پر ہے یا دوسرے ملک کے آخری کنارے پر ہے جو اس ملک سے متصل ہے، وہ روزہ رکھنے اور عید کرنے کا پابند نہیں ہوگا۔ تو اس بارے میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ فرماتے ہیں: وهذا ليس من دين المسلمين (فتاویٰ ابن تیمیہ: ج ۲۵/ص ۱۰۵) ”یہ صورت حال مسلمانوں کے دین میں شمار نہیں ہوتی۔“

چنانچہ اس بارے میں درست بات وہی ہے جس کا پتہ یہ حدیث بتاتی ہے صومکم يوم تصومون إيفطاركم يوم تفطرون وأضاحكم يوم تضحون یعنی ”تمہارا روزہ اسی دن ہے جب تم سب روزہ رکھتے ہوں، تمہارا افطار اسی دن ہے جب تم سب افطار کرتے ہو۔ اور قربانی تمہاری اس دن ہے جب تم سب قربانی کرتے ہو۔ پس جب کوئی شخص شعبان کی تیسویں رات کو رویتِ ہلال کی شہادت کسی جگہ سے دے دے، وہ جگہ قریب ہو یا بعید تو روزہ سب پر واجب ہو جاتا ہے۔“

خلاصہ کلام بیان کرتے ہوئے شیخ الاسلام نے لکھا ہے کہ جس شخص کو رویتِ ہلال کی خبر ایسے وقت میں ملے کہ اس میں روزہ یا عید یا قربانی ادا کی جاسکتی ہو تو بلاشبہ اس شہادت پر اعتبار کرنا واجب ہے، آثارِ سلف سے یہ بات ثابت ہے۔

## عقل اور شرع کی مخالفت

جو شخص رویتِ ہلال کے بارے میں قصر مسافت یا ملک کے مختلف ہونے کی قید لگاتا ہے، اس کا یہ قول عقل کے بھی خلاف ہے اور شرع کے بھی۔

بروایت ابو ہریرہؓ رسول خدا ﷺ نے فرمایا: الصوم يوم تصومون والفطر يوم تفطرون والأضحى يوم تضحون (صحیح سنن ترمذی: ۵۶۱) کہ ”جس دن تم روزہ رکھتے ہو (اللہ کے نزدیک) وہی روزہ ہے۔ جس دن افطار کرتے ہو، وہی افطار ہے اور جس دن قربانی کرتے ہو وہی قربانی ہے“

اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا اور اس کو غریب حسن کہا ہے۔ بعض اہل علم نے اس حدیث کا یہ معنی بیان کیا کہ شہادت کی بنا پر اگر تمام مسلمان یا ان کی اکثریت رؤیتِ ہلال کے فیصلہ پر متفق ہو جائے تو باقی لوگوں کو ان کی مخالفت نہیں کرنی چاہئے، وہ ان کے ساتھ ہی روزہ رکھیں، اور ساتھ نمازِ عید ادا کریں۔ محمد بن حسن شیبانی نے بھی اس حدیث کا یہی معنی بیان کیا ہے کہ رؤیتِ ہلال کے بارے میں منفرد آدمی جماعت کے تابع ہے۔ (تحفۃ الاحوذی)

شیخ الاسلام سے مسئلہ پوچھا گیا کہ ایک شخص اکیلا چاند دیکھتا ہے کیا وہ اپنی رؤیت کی بنا پر روزہ رکھے اور افطار کرے یا لوگوں کے ساتھ روزہ اور عید ادا کرے۔ انہوں نے فرمایا کہ اس بارے میں تین قول ہیں:

ایک قول یہ ہے کہ وہ روزہ رکھے اور افطار کرے مگر پوشیدہ کرے، یہ امام شافعیؒ کا مذہب ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ وہ لوگوں کے ساتھ روزہ رکھے اور نمازِ عید ادا نہ کرے، یہ مذہب امام احمدؒ، مالکؒ اور امام ابوحنیفہؒ کا ہے۔

تیسرا قول یہ ہے کہ روزہ بھی لوگوں کے ساتھ رکھے اور نمازِ عید بھی لوگوں کے ساتھ پڑھے۔ شیخ الاسلام نے تیسرے قول کو الصوم یوم تصومون والی حدیث کی روشنی میں ترجیح دی ہے کہ روزہ وہی ہے جس دن تم روزہ رکھتے ہو۔ افطار اور قربانی بھی وہی ہے جس دن تم افطار اور قربانی کرتے ہو۔ شیخ الاسلام نے اسی حدیث سے استدلال کیا ہے کہ شہادت ملنے پر تمام مسلمانوں کو روزہ اور نمازِ عید ادا کرنی چاہئے۔ (فتاویٰ ابن تیمیہ: ج ۲۵، ص ۱۱۴)

شوافع میں سے بعض ائمہ کا یہ قول ہے کہ جو بلاد ایک دوسرے کے قریب ہیں، ان میں سے ایک اہل بلد کی رؤیت دوسرے بلد کیلئے کافی ہو جائے گی۔ اگر ان میں بعد ہے تو اس صورت میں دو قول ہیں: ایک قول یہ ہے کہ ایسے بلاد میں سے ایک اہل بلد کی رؤیت دوسرے بلد کے لئے لازم نہیں۔ دوسرا قول وہ ہے جو ابو طیب اور ائمہ کی ایک جماعت کا ہے کہ جو بلاد ایک دوسرے سے دور ہیں، ان میں سے ایک اہل بلد کی رؤیت دوسرے بلد کیلئے کافی ہے۔ یہ قول امام شافعیؒ کی طرف منسوب ہے۔

## بعد کی تعریف

بعد کی تعریف کیا ہے، اس میں بھی ائمہ کے کئی اقوال ہیں۔ بعض نے مطالع کے اختلاف کو بعد کی بنیاد قرار دیا ہے یعنی جن بلاد کے مطالع میں اختلاف ہے، وہ ایک دوسرے سے دور شمار ہوں گے۔ عراقی علما کے نزدیک بعد کی یہ تعریف بھی قابلِ اعتماد ہے۔ امام

نوویؒ نے بھی روضہ میں اس تعریف کی صحت کا اعتراف کیا ہے۔

بعد کی تعریف میں دوسرا قول یہ ہے کہ مسافتِ قصر تک جتنے بلاد ہیں وہ ایک دوسرے کے قریب ہیں اور جو اس حد مسافت سے باہر ہیں، ان پر بعد کا اطلاق ہوتا ہے۔ یعنی وہ ایک دوسرے سے دور شمار ہوں گے، یہ قول امام بغویؒ کا ہے۔ رافعیؒ نے صغیر میں اس کو صحیح کہا ہے۔ (تحفۃ الاحوذی: ج ۲ ص ۳۶)

### خلاصہ

تمام بحث کا خلاصہ یہ ہے:

- ۱۔ چاند کا چھوٹا بڑا ہونا لوگوں کے لئے اوقات اور حج کا وقت معلوم کرنے کی علامت ہے۔
- ۲۔ رمضان کی ابتدا اور اس کی انتہا روایتِ ہلال یا شہادت پر مبنی ہے۔
- ۳۔ مطالع کا اختلاف ایک بدیہی اور فطری امر ہے۔
- ۴۔ ہلالِ رمضان کے لئے ایک مسلمان کی شہادت اور ہلالِ شوال (عید) کے لئے کم از کم دو مسلمانوں کی شہادت ضروری ہے۔
- ۵۔ رمضان کی خاطر ہلالِ شعبان کا تحفظ ایک ضروری امر ہے۔
- ۶۔ ریڈیو، ٹیلیفون، تار اور خبر رسانی کے دیگر ذرائع سے ملنے والی خبر قابلِ اعتبار ہے۔ بشرطیکہ یہ معلوم ہو کہ خبر دہندہ مسلمان ہے..... اور تار کے ذریعہ پہنچنے والی خبر حدِ تواتر کو پہنچ چکی ہے۔
- ۷۔ علامہ شوکانیؒ اور شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کا موقف روایتِ ہلال کے بارے میں یہ ہے کہ ایک اہل بلد کی روایت دوسرے بلد کے لئے معتبر ہے۔
- ۸۔ مسافتِ قصر اور ممالک کے مختلف ہونے کی قید ان کے نزدیک عقلاً و شرعاً درست نہیں۔
- ۹۔ ہمارے نزدیک علامہ شوکانیؒ اور شیخ الاسلام کا نظریہ صحیح معلوم ہوتا ہے کہ ایک اہل بلد کی روایت دوسرے بلد کے لئے معتبر ہے۔ اور ان پر روزہ لازم ہو جاتا ہے جب کہ ہر دو بلاد کا مطلع ایک ہو یا اتنا فرق ہو کہ اگر ایک بلد میں چاند طلوع ہوا ہے تو دوسرے بلد میں بھی اس کا طلوع ممکن ہو۔
- اگر ہر دو بلد کے مطالع میں اتنا فرق ہے کہ جب دونوں میں سے ایک بلد میں چاند طلوع ہو اور دوسرے میں طلوع نہ ہو بلکہ اس فرق سے تاریخ بدل جائے تو ایسے ہر دو بلاد میں سے ایک بلد میں دیکھا ہوا چاند دوسرے بلد کے لئے قطعاً کافی نہیں ہوگا۔ روزہ اور عید ادا کرنے میں وہ ایک دوسرے کے پابند نہیں ہوں گے۔ مغنی ابن قدامہ سے بھی ہمارے اس موقف کی تائید ہوتی ہے۔ انہوں نے لکھا ہے:

”اہل بلد کی رؤیت سے تمام اہل بلاد کے لئے روزہ لازم آتا ہے اور بعض نے یہ قید بھی لگائی ہے کہ بلاد ایک دوسرے کے اتنے قریب ہوں کہ ان کے مطالع میں اختلاف واقع نہ ہو مثلاً بغداد اور بصرہ کے درمیان مطالع میں کوئی بڑا اختلاف نہیں۔ لہذا ان میں سے ایک رؤیت دوسرے کے لئے کافی ہے اور جن بلاد میں بعد اس قدر زیادہ ہو کہ ان کا مطلع مختلف ہو جائے تو ان میں سے ایک کی رؤیت باقی بلاد کے لئے کافی نہیں۔ مثلاً عراق، حجاز، شام ان میں ہر ایک بلد کی رؤیت انہی کے لئے ہے، دوسروں کے لئے نہیں ہے۔ عکرمہ کے اس قول لکل بلد رؤیتہم کا یہی مطلب ہے کہ ایسے بلاد کی رؤیت اپنی اپنی ہے۔“ (مغنی ابن قدامہ: ج ۳ ص ۸۸)

### ایک غلط نظریہ

آخر میں اس غلط نظریہ کا ازالہ کر دینا بھی ضروری ہے کہ سعودی عرب جو اسلامی ممالک کے لئے ایک مرکز کی حیثیت رکھتا ہے، اس کے ساتھ ہی تمام اسلامی ملکوں میں روزہ اور عید کو ادا کرنا چاہئے۔ یہ نظریہ اسلامی تعلیم کے سراسر خلاف ہے۔ اس لئے کہ روزہ اور عید کا انحصار رؤیتِ ہلال پر ہے جیسا کہ حدیث میں ہے: صوموا لرؤیتہ و افطروا لرؤیتہ کہ چاند دیکھ کر روزہ رکھو اور چاند دیکھ کر افطار کرو۔ نیز مطالع کا اختلاف بھی ایسی حقیقت ہے کہ اس کا انکار ناممکن ہے، اس لئے یہ نظریہ سرے ہی سے غلط ہے کہ سعودی عرب کے ساتھ دیگر اسلامی ممالک روزہ رکھیں اور عید اور دیگر مناسک ادا کریں۔

### جغرافیائی اور علمِ ہیئت کا نظریہ

جغرافیائی لحاظ سے زمین کی حد بندی سے رؤیتِ ہلال کا کوئی تعلق نہیں، جس کی بنا پر یہ فیصلہ کیا جاسکے کہ ایک ملک کی رؤیت دوسرے ملک کے لئے یا ایک بلد کی رؤیت دوسرے بلاد کے لئے معتبر ہے یا نہیں؟ البتہ یہ حقیقت ہے کہ زمین کا جو حصہ طلوعِ ہلال کے وقت اس کے سامنے ہوگا، اس تمام حصہ میں رؤیتِ ہلال کا تصور ہوگا، اس علاقہ میں ایک ملک شامل ہو یا زیادہ، ایک بلد ہو یا زیادہ بلاد ہوں۔ ان سب کا مطلع ایک شمار ہوگا۔ ملکوں کے مختلف ہونے یا مسافتِ قصر وغیرہ کی حد بندی کرنا شریعت اور عقل کی رو سے درست نہیں۔ علمِ ہیئت اور جغرافیہ دان حضرات نے اپنے تجربہ کی بنا پر کہا ہے کہ

”غروبِ آفتاب کے وقت چاند اگر کسی بلد میں آٹھ درجے بلند ہے تو غروبِ آفتاب کے بعد تیس منٹ تک رہے گا تو ایسا چاند مشرقی علاقہ میں پانوساٹھ میل تک ضروری موجود ہوگا۔“

اسی طرح ان کا کہنا ہے کہ جس بلد میں چاند آٹھ درجے بلند ہو، اس بلد سے جو بلد ستر میل مشرق میں ہے، وہ سات درجے پر ہوگا اور جو بلد اس بلد سے مغرب میں ہے وہاں چاند نو درجے پر ہوگا۔ جب ایک بلد میں چاند نظر آجائے تو اس کے قریب جتنے بلاد ہیں، ان میں چاند طلوع ہو چکتا ہے۔

یہ بات علمِ ہیئت کی مسلمات میں سے ہے اور اس بلد کے مشرق کی جانب پانوساٹھ میل تک طلوعِ ہلال کا اعتبار ہوگا لیکن مغربی بلاد میں رویتِ ہلال کا مطلق اعتبار ہوگا۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نے بھی اس طرف اشارہ کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ”مشرق میں چاند نظر آجائے تو مغرب میں اس کا طلوع ضروری ہے لیکن مغرب میں دیکھنے سے مشرق میں دیکھا جانا ضروری نہیں۔“

### چھ ماہ یا کم بیش مدت کے دن؟

بعض ایسے علاقے ہیں وہاں چھ ماہ کا دن اور چھ ماہ کی رات ہوتی ہے بلکہ بعض ایسے علاقے بھی ہیں جہاں غروبِ آفتاب کے تھوڑی دیر بعد فجر طلوع ہو جاتی ہے۔ ایسی صورت میں جو ان علاقوں کے ہمسایہ ملک یا علاقے ہیں، ان کے اوقات کے مطابق اندازہ کر کے نماز پڑھی جائے اور روزے رکھیں جائیں، چنانچہ جامع ترمذی میں نواس بن سمعان سے روایت ہے کہ

”دجالِ زمان میں چالیس دن قیام کرے گا۔ ایک دن سال بقدر دوسرا دن مہینہ بقدر تیسرا دن جمعہ بقدر ہوگا اور باقی دن عام دنوں کے برابر ہوں گے۔ صحابہؓ نے دریافت کیا کہ اے اللہ کے رسولؐ کہ جب دن سال بقدر ہوگا تو اس میں صرف ایک دن کی نمازیں کفایت کریں گی؟ آپؐ نے فرمایا: نہیں، اندازہ کر کے سال بھر کی نمازیں پڑھی جائیں۔“

مزید استفادے کے لئے ’رویتِ ہلال‘ پر محدث کے درج ذیل مضامین کا مطالعہ کریں

۱۰ تا ۲	جلد ۳۱ عدد ۳	صلاح الدین یوسف، حافظ رویتِ ہلال کا مسئلہ، شکوک و شبہات کا ازالہ
۵ تا ۲	جلد ۳۱ عدد ۶	صلاح الدین یوسف، حافظ مسئلہ رویتِ ہلال اور رویتِ ہلال کمیٹی
۳۸ تا ۴۷	جلد ۵ عدد ۱	عبداللہ بن حمید، شیخ رویتِ ہلال کا مسئلہ، ادلہ شرعیہ کی روشنی میں
۳۱ تا ۳۶	جلد ۷ عدد ۱۰	عزیز زبیدی، مولانا رویتِ ہلال عید (عید کا چاند) کے متعلق چند غلط فہمیاں
۲۶ تا ۱۸	جلد ۷ عدد ۹	عزیز زبیدی، مولانا رویتِ ہلال کمیٹی کی ضرورت شہری حیثیت اور طریقہ کار
۲۸ تا ۴۷	جلد ۷ عدد ۹	عزیز زبیدی، مولانا رویت کے متعلق حکمران یا کمیٹی کے فیصلہ کی شرعی حقیقت
۲۱ تا ۱۷	جلد ۳۱ عدد ۴	علمائے ہند رویتِ ہلال میں اختلافِ مطالعہ معتبر ہے



## حضرت عائشہ صدیقہؓ کے نکاح اور رخصتی کی عمر

اسلام سیاسی، مذہبی، ملکی، تاریخی ہر قسم کی جملہ خوبیوں کا حامل دین ہے۔ اس میں جہاں تہذیب اور تزکیہ نفس کی تعلیم دی گئی ہے، وہاں گزشتہ اقوام و ملل کے حالات و واقعات بھی بتلائے گئے ہیں۔ جس طرح قرآن و حدیث میں اُمثال و عبر اور بصائر و حکم ذکر کئے گئے ہیں، اسی طرح اُمم سابقہ کے اخبار و قصص بھی جا بجا بیان کئے گئے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ اسلام میں مذہبی اسفار و کتب کے علاوہ تواریخ و سیر میں بھی بے شمار کتابیں علماء اسلام کی لکھی ہوئی موجود ہیں۔ کیونکہ مذہبی حیثیت سے انہیں ان جملہ علوم کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ جس طرح ان کے پاس مذہبی احکام و مسائل کا ایک نہایت اہم اور جامع مجموعہ ہے، اسی طرح تاریخی معلومات کا بھی ذخیرہ ان کے پاس موجود ہے۔

چنانچہ وہ مغربی اقوام جنہیں آج اپنے علم و فضل اور تاریخ دانی پر بڑا ناز ہے، انہوں نے صاف لفظوں میں اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ اہل اسلام نے اپنے مذہب کے ماتحت اس فن میں جو کمال دکھایا ہے اور اپنے بزرگوں کی تاریخ کا جس قدر عظیم الشان ذخیرہ جمع کیا ہے وہ تمام دنیا کیلئے قابل حیرانگی ہے۔ ائمہ اسلام کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے کہ ان بزرگوں نے نہ صرف قرآن و حدیث کے جمع و تدوین اور اس کی تالیف و تصنیف تک اپنی مساعی جمیلہ کو پھیلایا بلکہ تین سو برس تک کے ہزاروں لاکھوں امامان دین اور حاملان شریعت کے ہر ہر واقعہ کو قلمبند کر دیا۔ اور ولادت سے وفات تک ان کے واقعات کو جمع تاریخ و سال کتابی صورت میں جمع کر دیا۔

جس قوم کا مذہبی اور تاریخی معیار اس قدر بلند اور ہمہ گیر ہو کہ اس نے اپنی جماعت کے حالات و واقعات کے جمع و ترتیب میں اس قدر سعی و تبلیغ کی ہو اور تفتیش و تحقیق میں کسی قسم کا تغافل نہ برتا ہو، کیا اس کے لئے یہ ممکن ہے کہ اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ جیسی مقدس اور محترم ہستی کی نسبت اس قسم کا تغافل برتیکہ بجائے ۱۶ برس کے آپؓ کے نکاح کی عمر کو ۶ برس اور آپؓ کی رخصتی کی عمر کو ۱۹ برس کے بجائے صرف ۹ برس لکھ دے۔ اور پھر چودہ صدیوں کے تمام مسلمان ایک خلاف واقعہ امر کو آنکھ بند کئے مانتے چلے آئے ہوں۔ اور اسی طرح اس چودھویں صدی میں اس کا انکشاف ہوا کہ آپؓ کے نکاح کی صحیح تاریخ ۱۶ برس اور رخصتی ۱۹ برس ہے۔

گویا آج تک کے تمام علماء اسلام، کیا فقیہ، کیا محدث، کیا مفسر اور کیا مؤرخ سب کے سب اس واقعہ کے متعلق دس برس کی نہایت زبردست اور فاش غلطی کے جرم کا ارتکاب کرتے آئے۔ (معاذ اللہ) کیونکہ سلف سے خلف تک کسی نے بھی یہ بات نہیں کہی کہ ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کی عمر بوقت نکاح ۱۶ برس اور بوقت رخصتی ۱۹ برس کی تھی۔ بلکہ سب کے سب اس امر پر متفق ہیں کہ جناب عائشہؓ کا نکاح چھ یا سات برس کی عمر میں ہوا تھا اور آپ کی رخصتی ۹ برس کی عمر میں عمل میں آئی تھی۔

### آپؓ کی تاریخ ازدواج کے متعلق کتب اسلامیہ کا متفقہ بیان

چونکہ آپ کے واقعہ نکاح کو مذہب، اخلاق، معاشرت ہر ایک سے یکساں تعلق تھا، اس لئے علماء حدیث، فقہ، اور اصحاب سیرت ہر ایک نے آپ کے واقعہ نکاح کو لیا ہے اور سب نے یہی بیان کیا ہے کہ حضرت عائشہؓ کی عمر بوقت نکاح چھ یا سات برس کی تھی اور بوقت رخصتی ۹ برس۔ چنانچہ صحیح بخاری، صحیح مسلم، ابوداؤد اور نسائی ان چاروں کتابوں کی متفقہ روایت یہ ہے:

عن عائشة قالت تزوجني رسول الله ﷺ وأنا بنت ست سنين فقدمنا المدينة فنزلنا في بني الحارث بن خزرج فوعكت فتمزق شعري فوفى جميمة فاتتني أمي أم رومان وإنني لفي أرجوحة ومعى صواحب لي فصرخت بي فأتيتها لا أدرى ما تريد بي فأخذت بيدي حتى أوقفتني على باب الدار وإنني لأنهج حتى سكن نفسي ثم أخذت شيئاً من ماء فمسحت وجهي ورأسي ثم أدخلتني الدار فإذا نسوة من الأنصار في البيت فقلن على الخير والبركة وعلى خير طائر فأسلمتني إليهن فأصلحن من شأنى فلم يرعنى إلا رسول الله ﷺ ضحى فأسلمنني إليه وأنا يومئذ بنت تسع سنين (صحیح بخاری: حدیث نمبر ۳۸۹۴)

”حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ جس وقت آنحضرت ﷺ نے مجھ سے نکاح کیا، اس وقت میری عمر چھ برس کی تھی۔ اس کے بعد ہم لوگ (ہجرت کر کے) مدینہ گئے اور وہاں قبیلہ بنی حارث میں قیام ہوا۔ اس کے بعد مجھے ایسا بخار آیا کہ سر کے تمام بال جھڑ گئے، پھر (از سر نو نکل کر) کندھوں تک ابھی پہنچے تھے کہ میری ماں (ام رومان) میرے پاس آئیں اور میں اس وقت لڑکیوں کے ساتھ جھولا جھول رہی تھی۔ میں ماں کے پاس چلی گئی۔ مجھے کچھ خبر نہیں کہ آج کیا معاملہ ہونے والا ہے۔ وہ میرا ہاتھ پکڑ کر دروازہ پر (تھوڑی دیر) رکے رہیں۔ میری سانس (کھیل کی وجہ سے) چڑھ رہی تھی۔ جب سکون ہوا تو ماں نے پانی لے کر میرا منہ اور سر دھویا۔ پھر مکان میں لے کر گئیں۔ (گھر میں پہنچ کر دیکھتی ہوں کہ) انصار کی عورتیں وہاں موجود ہیں، وہ مجھے دعائے خیر اور مبارک باد دینے لگیں۔ ماں نے مجھے ان عورتوں کے حوالہ کیا، انہوں نے میرا بناؤ سنگھار کیا۔ اب تک مجھے کچھ خبر نہیں ہوئی یہاں تک کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا۔ اور پھر مجھے ان عورتوں

نے آپ کے سپرد کر دیا۔ اور اس وقت میری عمر کل ۹ برس کی تھی۔“

ابوداؤد، نسائی، صحیح مسلم اور صحیح بخاری کی یہ متفقہ روایت ہے اور لطف یہ ہے کہ اس واقعہ کی راوی بھی خود حضرت عائشہؓ ہی ہیں اور آپ خود اپنا واقعہ اپنی زبان سے فرما رہی ہیں۔ اور نہایت صراحت کے ساتھ بتلا رہی ہیں کہ مکہ مکرمہ میں چھ برس کی عمر میں میرا آنحضرت ﷺ سے نکاح ہوا۔ اور مدینہ منورہ میں ۹ برس کی عمر میں میری رخصتی ہوئی۔ کیا ایسی پختہ اور معتبر روایت مل جانے کے بعد بھی کسی اور طرف نظر کرنے کی ضرورت باقی رہتی ہے۔ کیونکہ یہ حدیث نہ صرف سنن کی ہے بلکہ صحیحین کی بھی ہے جس میں صحیح بخاری بھی شامل ہے۔ اور صحیح بخاری کی صحت اور اعتبار کا جو درجہ اسلام میں تسلیم کیا گیا ہے کسی سے مخفی نہیں کہ ”روئے زمین پر قرآن شریف کے بعد سب سے زیادہ معتبر کتاب صحیح بخاری ہے۔“

تمام فقہاء امت بھی نکاح کے وقت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی اسی عمر کے قائل ہیں۔ اور اسی کو مد نظر رکھتے ہوئے کتنے مسائل کی کتب فقہ میں ’تفریع‘ کی گئی ہے۔ کتاب الاستیعاب فی معرفة الأصحاب جو صحابہ کے حالات میں نہایت جامع، مبسوط اور معتبر کتاب ہے، اس میں بھی آپ کی عمر یہی مذکور ہے۔ چنانچہ آپؓ کے ترجمہ میں اس کتاب کی عبارت یہ ہے:

**عائشہ** بنت ابی بکر الصدیقؓ زوج النبی ﷺ تزوجها رسول اللہ ﷺ بمكة قبل الهجرة بسنتين هذا قول أبی عبیدة وقال غيره بثلاث سنين وهی بنت ست سنين وقيل سبع سنين وابتنى بها بالمدينة وهی ابنة تسع لأعلمهم اختلفوا فی ذلك (استیعاب ص ۳۵۶ علی هامش الإصابة)

”حضرت عائشہؓ: (آپؓ) حضرت ابوبکرؓ کی بیٹی ہیں۔ آپ کا نکاح رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مکہ میں ہوا تھا۔ ابو عبیدہ کا بیان ہے کہ ہجرت کے دو سال قبل یہ نکاح ہوا تھا اور بعض لوگوں کا بیان ہے کہ تین سال قبل ہوا تھا۔ اس وقت آپ کی عمر چھ برس کی تھی اور بعض لوگوں کا خیال ہے کہ سات برس کی تھی۔ اور جس وقت آپ کی جناب رسول اللہ ﷺ کے گھر رخصتی ہوئی ہے، اس وقت آپ کی عمر کل نو برس کی تھی۔ مجھے اس بارے میں کسی کا اختلاف معلوم نہیں۔“

یعنی آپ کے نکاح کی عمر میں تو ذرا سا اختلاف ہے کہ کسی نے چھ، کسی نے سات برس کی عمر بتلائی ہے مگر رخصتی کی عمر سب کے نزدیک ۹ برس مسلم پچس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے۔ اب رہا یہ چھ سات کا اختلاف تو اہل نظر کے نزدیک کچھ اہم نہیں ہے۔ حافظ ابن حجرؒ اپنی کتاب ’اصابہ‘ میں لکھتے ہیں:

**عائشہ** بنت أبی بکر الصدیقؓ ولدت بعد المبعث بأربع سنين أو خمس فقد ثبت فی الصحيح أن النبی ﷺ تزوجها وهی بنت ست وقيل سبع و يجمع بأنھا كانت أكملت السادسة ودخلت فی السابعة ودخل بها وهی بنت تسع (۳۵۶/۴)

”عائشہؓ..... حضرت ابوبکرؓ کی لڑکی ہیں۔ نبوت کے چوتھے یا پانچویں سال آپ کی ولادت ہوئی ہے کیونکہ صحیح حدیث سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ جب آنحضرت ﷺ نے آپ کے ساتھ نکاح کیا تھا تو اس وقت آپ کی عمر چھ برس یا بقول بعض سات برس کی تھی۔ اور ان دونوں اقوال میں کچھ اختلاف نہیں۔ اس کی صورت یہ ہو سکتی ہے کہ آپ چھ برس کی عمر پوری کر کے ساتویں برس میں داخل ہو چکی تھیں۔ اور آپ کی رخصتی ہوئی جبکہ آپ کی عمر ۹ برس کی تھی۔“

یعنی یہ اختلاف کوئی اختلاف نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ آپ چھ برس کی ہو چکیں تو ساتویں سال میں پہنچ گئیں۔ لہذا جس نے چھ سال کہا، اس نے کامل سال مراد لیا اور جس نے سات سال بتلایا، اس نے اس نئے سال کو بھی داخل کر لیا۔ الغرض آپ کی نکاح کی یہ عمر بالکل صحیح اور یقینی ہے۔ اور ان کتب مذکورہ کے علاوہ بھی جتنی کتابیں حدیث و سیر کی ہیں، سب میں آپ کی عمر یہی مذکور ہے کہ بوقت نکاح چھ برس اور بوقت رخصتی نو برس تھی۔

### موجودہ صدی کی نئی تحقیق کی واضح غلطی

اس اہم اور مشہور واقعہ پر اسلام کی تیرہ صدیاں گزر چکیں مگر کسی نے اس واقعہ کی تاریخ کو غلط ثابت کرنے کی ہمت نہیں کی۔ کیونکہ اسلام کے جملہ دوادین و کتب میں کہیں ایک حرف بھی اس کے خلاف نہیں ہے۔ کتب اسلامیہ اس بات پر متفق ہیں کہ حضرت عائشہؓ کی نکاح کی عمر چھ برس اور رخصتی کی عمر نو برس ہے مگر آج کے بعض تجدید پسند اصحاب نے، مشکوٰۃ شریف کے اخیر میں جو ایک رسالہ امام خطیب کا لگا ہوا ہے، اس کی ایک عبارت دیکھ کر فوراً یہ لکھ دیا اور اخباروں کے ذریعہ تمام ملک میں اس کی اشاعت بھی کر دی کہ حضرت عائشہؓ کی عمر بوقت نکاح ۱۶ برس اور بوقت رخصتی ۱۹ برس تھی۔

امام خطیب (مؤلف مشکوٰۃ) کی جس عبارت سے یہ اخذ کیا گیا ہے، وہ حضرت اسماءؓ جو حضرت عائشہؓ کی بڑی بہن تھیں، کا ترجمہ (حالات زندگی) ہے۔ اس کی اصل عبارت یوں ہونی چاہئے:

ہی اکبر من أختها عائشة بعشرين سنين وماتت وله مائة سنة وذلك سنة ثلاث وسبعين (الاکمال، ص ۳۳ ملحقہ مشکوٰۃ شریف) ”اسماء بنت ابی بکر..... اپنی بہن حضرت عائشہؓ سے بیس برس بڑی تھیں، ۷۳ ہجری میں ایک سو برس کی عمر میں آپ کی وفات ہوئی۔“

امام خطیب کی اصل عبارت تو یوں تھی جو ہم نے درج کی لیکن اللہ کا تب پر رحم کرے کہ اس نے عشرين کی جگہ عشر لکھ دیا جس سے ۱۰ عدد کا فرق پڑ گیا۔ یعنی بیس کی بجائے دس ہو گیا۔ اب اس عبارت کا ترجمہ یہ ہو گیا کہ حضرت اسماءؓ حضرت عائشہؓ سے صرف دس برس بڑی تھیں۔

اور اس صورت میں حضرت عائشہؓ جو اپنی بہن اسماءؓ سے بیس برس چھوٹی تھیں، عمر میں صرف دس

برس کم رہ گئیں۔ اور یہاں یہ بھی مذکور ہے کہ حضرت اسماءؓ ایک ہجری میں ۲۷ برس کی تھیں۔ کیونکہ ۷۳ ہجری میں آپ کی عمر سو برس کی ٹھہری تو ایک ہجری میں ۲۷ برس یقینی امر ہے۔ اسی غلطی پر بنیاد بناتے ہوئے جب حضرت عائشہ کی عمر ایک ہجری میں نکالی جائے تو دس برس چھوٹی ہونے کی وجہ سے ۱۷ برس بنتی ہے۔ اگر عمر کا فرق ۲۰ برس کا ہو تو ایک ہجری میں حضرت عائشہ کی عمر ۷ برس بنتی۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں سے ہمارے واقعہ نگار کو غلطی لگی۔

لیکن ہمارے عجلت پسند بزرگ اسی رسالہ کا وہ مقام دیکھ لیتے جو خاص حضرت عائشہؓ ہی کے ترجمہ کے ساتھ مخصوص ہے تو ہرگز اس فاش غلطی کا ارتکاب نہ کرتے۔ چنانچہ یہی امام خطیب اسی رسالہ میں حضرت عائشہؓ کے ترجمہ میں لکھتے ہیں کہ

عائشة الصديقة أم المؤمنين: عائشة بنت أبي بكر الصديق خطبها النبي ﷺ

وتزوجها بمكة في شوال سنة عشر من النبوة قبل الهجرة بثلاث سنين وأعرس بها بالمدينة في شوال سنة اثنتين من الهجرة على رأس ثمانين عشر شهراً ولها تسع سنين وقيل دخل بها بالمدينة بعد سبعة أشهر من مقدمه وبقيت معه تسع سنين ومات عنها ولها ثمانين عشرة سنة (الاكمال: ص ۲۸)

”عائشہ صدیقہ ام المؤمنین: یہ عائشہ حضرت ابوبکرؓ کی لڑکی ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے آپ کو نکاح کا پیغام دیا اور آپ سے مکہ میں شوال کے مہینہ میں نکاح کیا۔ (یہ واقعہ ۱۰۰ نبوت میں ہوا یعنی ہجرت سے تین برس پہلے اور آپ نے ان کو ۱۸ مہینہ گزرنے کے بعد ۲ ہجری میں اپنی لہن بنایا جس وقت آپ کی عمر کل ۹ برس کی تھی اور بعض کا بیان ہے کہ یہ خلوت مدینہ میں تشریف آوری کے صرف سات ماہ بعد واقع ہوئی اور آنحضرت ﷺ کے ساتھ آپ کا قیام بھی (مکہ کے قیام کی طرح) صرف ۹ ہی برس رہا اور آنحضرت ﷺ کے وصال کے وقت آپ کی کل عمر صرف اٹھارہ برس کی تھی۔“

اس صاف و صریح بیان کے بعد کہ ۶ برس کی عمر میں نکاح ہوا اور ۹ برس کی عمر میں رخصتی ہوئی اور ۱۸ برس کی عمر میں بیوگی کا صدمہ اٹھایا، کیا کوئی منصف اور عقل مند شخص اس کے بعد اس امر کے یقین کرنے میں تامل کر سکتا ہے کہ حضرت اسماءؓ کے ترجمہ میں عشرین کی بجائے عشر کا لفظ، محض کتابت کی غلطی ہے۔ ہمیں سخت تعجب ہے کہ لائق مضمون نگار نے اس اصل مضمون سے کیونکر غفلت کی اور ایک غلط عبارت کے ذریعہ تمام دنیا کو غلط فہمی میں مبتلا کرنے کی کوشش کی۔ اگر واقعہ یہ مقام آپ کی نظر سے نہیں گزرا تو یہ ایک اہل علم کے لئے یہ ناقابل معاف چرچہ ہے۔ کیونکہ یہ مضمون اسی رسالہ میں ہے جس میں سے آپ مضمون لکھ رہے ہیں اور یہی مقام آپ کے ماخذ کا اصل سرچشمہ ہے۔ اور اگر دیدہ دانستہ اس بددیانتی کا ارتکاب

کیا گیا ہے تو ہمارے خیال میں اس سے بڑھ کر ظلم و خیانت کی شاید کوئی اور مثال نہیں ملے گی۔ اب رہا کتابت میں اس قسم کی غلطیوں کا ہو جانا یہ تو روزمرہ کی بات ہے۔ اہل نظر کے لئے ایسی بہت سی مثالیں موجود ہیں، اکائی دہائی کی آئے دن غلطیاں ہوتی رہتی ہیں۔ مگر قرآن بھی تو کوئی چیز ہیں خصوصاً اس حالت میں کہ اسی واقعہ کو دوسری جگہ بالکل صاف اور واضح کر دیا گیا ہو اور جملہ دوا دین و کتب بھی اس کی تصدیق کرتی ہوں۔

اس موقع پر ہمیں اپنے ان محترم معاصرین سے بھی شکایت ہے جنہوں نے اس صحیح مسلک کی تائید کرتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ امام خطیب سے اس جگہ غلطی ہو گئی ہے یا یہ کہا گیا کہ یہ رسالہ کوئی ایسا اہم رسالہ نہیں ہے۔ کیونکہ جب تک کسی کی غلطی یقینی طور پر معلوم نہ ہو، تب تک اس قسم کا لفظ بولنا بالکل غیر موزوں ہے بالخصوص امام خطیب جیسے بلند پایہ شخص کی طرف جو اس میدان کا اعلیٰ شہسوار ہے۔

### حضرت عائشہ کے نکاح پر عقلی اعتراضات

اہل اسلام میں جب تک وسعتِ علم اور دقتِ نظر کا عنصر غالب رہا، کسی فرد نے اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی اس عمر میں شادی کو غیر معقول خیال نہیں کیا۔ مگر آج جبکہ ہر طرف کفر و الحاد کا غلبہ ہے اور تجد و نیجریہ کا دور دورہ ہے، اس نکاح پر عقلی اعتراضات وارد کئے جارہے ہیں۔ اس موقع پر جو سوالات آج کل عموماً اٹھائے جاتے ہیں، وہ درج ذیل ہیں:

- ۱۔ حضرت عائشہؓ جیسی کسمن لڑکی سے آنحضرت ﷺ کو شادی کرنے کی کیا ضرورت پیش آئی؟
  - ۲۔ آیا اس عمر کی لڑکی دلہن بننے اور ازدواجی ضرورت کے رفع کرنے کی اہلیت رکھتی ہے یا نہیں؟
  - ۳۔ کیا رسول اللہ ﷺ کو اس سے زیادہ عمر کی لڑکی نہیں مل سکتی تھی کہ اس کسمن بچی کے ساتھ عقد کیا؟
- یہی وہ شکوک و اوہام ہیں جو بطریق سوال پیش کئے جارہے ہیں۔ اس لئے ضرورت ہے کہ اس موقع پر ان کا جواب بھی دے دیا جائے۔

### پہلا سوال اور اس کا جواب

یہ متفقہ مسئلہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کی بعثت تمام دنیا کے واسطے تھی اور ہے۔ اور دین اسلام کی تکمیل آپ ہی کے ہاتھوں ہونے والی تھی اور ہوئی۔ ایسی صورت میں یہ ضروری تھا کہ طبقہ اناث کو احکام و مسائل بتلانے کے لئے آپ کے عقد میں جہاں کئی ایک عمر رسیدہ خواتین ہوں، وہاں ایک کسمن خاتون بھی ضرور ہونی چاہئے تاکہ وہ کسمن اور کنواری بچیاں جو فرط حیا سے ماں برابر جیسی عورتوں سے اپنے مخصوص مسائل پوچھنے میں حیا محسوس کریں، وہ خاص آپ سے مل کر اپنے حالات کا اظہار کر کے اپنی تشفی کر سکیں۔ اور اس

کے لئے صرف حرم نبوی میں داخل ہونا ہی ضروری نہ تھا بلکہ اس کے ساتھ اعلیٰ درجہ کی قابلیت کا پایا جانا بھی ضروری تھا جو احکام و مسائل کے سمجھنے میں کافی مدد دے سکے۔

حالات و واقعات اس امر پر شاہد عدل ہیں کہ اس مخصوص انداز میں جو حضرت عائشہؓ کو قدرتی طور پر فضیلت حاصل تھی، وہ ازواجِ مطہرات میں سے کسی اور کو باوجود زیادتی سن کے حاصل نہ تھی۔ اور یہی وجہ ہے کہ جس قدر احکام و مسائل حضرت عائشہؓ سے منقول ہیں، کسی اور بیوی سے اس کا عشرِ عشر بھی نہیں پایا جاتا۔ اسی لئے تمام دنیائے اسلام بھی آپ کے فضل و کمال کی معترف ہے۔ ’الاستیعاب‘ میں عطار بن ریاح جیسے جلیل القدر بزرگ سے مروی ہے کہ

كانت عائشة أفقه الناس وأعلم الناس وأحسن الناس رأياً في العامة (استيعاب على الاصابة: جلد ۲ ص ۲۵۸) ”حضرت عائشہؓ تمام لوگوں میں زیادہ سمجھدار اور سب سے زیادہ علم والی اور عام طور پر نہایت پختہ رائے رکھنے والی تھیں۔“

اسی کتاب میں امام ابوالضحیٰ سے مروی ہے کہ حضرت مسروق فرماتے تھے کہ

رأيت مشيخة من أصحاب رسول الله ﷺ الأكابر يستلونها عن الفرائض ”میں نے آنحضرت ﷺ کے بڑے بڑے جلیل القدر اصحاب کو دیکھا کہ وہ حضرت عائشہؓ سے فرائض کے مسائل دریافت کیا کرتے تھے“

ہشام بن عروہؓ کا بیان ہے کہ میرے والد مکرم فرمایا کرتے تھے

ما رأيت أحدا أعلم بفقه ولا بطب ولا بشعر من عائشة رضي الله عنها ”میں نے کسی کو حضرت عائشہؓ سے زیادہ عالم نہیں پایا۔ فقہ، طب، شعر ان میں سے کسی ایک میں بھی کوئی ان کا ہم پلہ عالم نہ تھا۔“

امام زہریؒ جو صحابہ کرام کے حالات سے بہترین واقفیت رکھنے والے اور علم حدیث اور فقہ کے مسلمہ امام ہیں، ان کا بیان ہے کہ

لو جمع علم عائشة إلى علم جميع أزواج النبي ﷺ وعلم جميع النساء لكان علم عائشة أفضل

”اگر حضرت عائشہؓ کا علم ایک پلہ میں رکھا جائے اور تمام ازواجِ مطہرات اور دیگر تمام عورتوں کا دوسرے پلہ میں اور یہ تمام علم سے آراستہ ہو کر آئیں تو پھر بھی حضرت عائشہؓ ہی کے علم کا پلہ بھاری رہے گا۔“

ابو بردہؓ اپنے والد ابو موسیٰؓ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ فرماتے تھے

ما أشكل علينا أمر فساءلنا عنه عائشة إلا وجدنا عندها فيه علماً ”مشکل سے مشکل مسئلہ بھی حضرت عائشہؓ سے دریافت کیا جاتا تو اس کے متعلق بھی علم کا خزانہ

ان کے پاس موجود نظر آتا تھا۔“

یہ تمام حالات کتاب الاستیعاب اور الاصابہ سے لئے گئے ہیں جو اس فن کی اعلیٰ درجہ کی معتبر کتابیں شمار ہوتی ہیں۔ ان واقعات و حالات سے یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو گئی کہ حضرت عائشہؓ کو قدرت کی طرف سے ایسی مافوق العادت استعداد و قابلیت و دیعت کی گئی تھی کہ عرب کیا ساری دنیا کی عورتوں میں اب تک اس کی نظیر نہیں پائی گئی۔ حتیٰ کہ وہ ازواجِ مطہرات جو آپ سے قبل آنحضرت ﷺ کے فیضِ صحبت سے مستفیض ہو رہی تھیں اور ان میں سے اکثر کا تعلق اعیانِ قریش اور ضادید عرب ہی سے تھا، ان میں سے ہر ایک نے آنحضرت ﷺ کی صحبت بھی آپ سے کہیں زیادہ پائی تھی مگر پھر بھی جو فضل و کمال اس کمسن اور خوردسال میں پایا گیا، وہ کسی اور معمر، عمر رسیدہ میں نظر نہ آیا۔ ایسی صورت میں جبکہ قدرت نے پہلے ہی سے آپ کو فضل و کمال کے بے انتہا محاسن عطا کر رکھے تھے اور نکاح کے بعد آپ کی ذاتِ گرامی سے وہ علم و فضل کے چشمے جاری ہوئے کہ اس وقت سے لے کر آج تک کے تمام اہل اسلام اس کے بغیر تشنہ کام نظر آ رہے ہیں، کیا کسی کو یہ کہنا سزاوار ہے کہ آپ نے تمام عرب میں سے اسی کمسن اور خوردسال بچی کو کیوں منتخب فرمایا!!!؟

امرواقعہ بھی یہ ہے کہ جس قدرت کی طرف سے آپ کے اندر فضل و کمال کے یہ جواہرات و دیعت کئے گئے تھے اور دنیا کی ہدایت کے لئے آپ کی ذاتِ گرامی کو منتخب کیا گیا تھا، اسی کی طرف سے آنحضرت ﷺ کو رسم ازدواجی کے پورا کرنے کا اشارہ بھی فرما دیا گیا تھا۔ چنانچہ حافظ ابن عبد البر ’الاستیعاب‘ میں لکھتے ہیں کہ

كان رسول الله ﷺ قد رأى عائشة في المنام في سرقة من حرير فتوفيت خديجة فقال إن يكن هذا من عند الله يمضه فتزوجها بعد موت خديجة

”آنحضرت ﷺ نے حضرت عائشہؓ کو ریشم کے کپڑے میں خواب میں دیکھا۔ اس کے بعد حضرت خدیجہؓ کا انتقال ہو گیا تو آپ نے فرمایا کہ اگر یہ خواب خدا کی طرف سے ہے تو وہ اس کو سچا کر دکھائے گا (چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ) حضرت خدیجہؓ کے بعد آپ نے حضرت عائشہؓ سے نکاح کیا“

’الاصابہ‘ میں حافظ ابن حجرؒ اس خواب کا ذکر خود حضرت عائشہؓ ہی کی زبان سے نقل کرتے ہیں کہ آپ کہا کرتی تھیں:

أعطيت خللا ما أعطيتها امرأة: ملكني رسول الله ﷺ وأنا بنت سبع وأتاه الملك بصورتي في كفه لينظر إليها وبنى بي لتسع..... الخ

”مجھے بعض ایسی فضیلتیں عطا کی گئیں کہ وہ کسی اور بی بی کو نصیب نہ ہونیں: (ایک) یہ کہ سات سال کی عمر میں آنحضرت ﷺ نے مجھے اپنی بیوی بنایا، (دوسرے): یہ کہ فرشتہ میری صورت اپنی



تھیلی میں لے کر آپ ﷺ کو دکھلانے کے لئے لایا، (تیسرے): یہ کہ ۹ برس کی عمر میں میرے ساتھ آپ نے خلوت کی..... الخ“

بخاری شریف کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ دو بار آپ کو اس نکاح کی طرف بذریعہ خواب توجہ دلائی گئی۔ چنانچہ حضرت عائشہؓ کی ہی زبانی آنحضرت ﷺ کا بیان ان لفظوں میں مذکور ہے:

أريتك في المنام مرتين إذا رجل يحملك في سرقة حرير فيقول هذه امرأتك فأكشفها فإذا هي أنت فأقول إن يكن هذا من عند الله يمضه (بخاری: کتاب العہر حدیث نمبر ۷۱۱)

”تم مجھے دو بار خواب میں اس طرح سے دکھلائی گئیں کہ ایک شخص تم کو ریشم کے کپڑے میں لپیٹ کر دکھلاتا ہے کہ یہ آپ کی بیوی ہیں۔ میں جب کپڑا اٹھا کر دیکھتا تو تمہاری صورت نظر آتی تھی۔ میں نے کہا کہ اگر یہ خواب خدا کی طرف سے ہے تو پورا ہو کر رہے گا۔“

بعض روایات میں تین بار کا بھی ذکر آیا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ قدرت کو پہلے ہی سے یہ بات مد نظر تھی کہ آپ کی ذات سے اسلام کو تقویت ہو۔ چنانچہ اس کا ثبوت ان خوابوں سے واضح ہو گیا۔ کیونکہ اسلامی مفاد مد نظر نہ ہوتا تو بذریعہ خواب آنحضرت ﷺ کو بشارت دیے جانے کی ضرورت نہ تھی۔ اور یہی وجہ تھی کہ پہلے ہی سے آپ کے روحانی اور جسمانی حالات قدرتی طور پر مانفوق العادت ترقی پذیر تھے۔ قدرت کی یہ تربیت خاص انداز میں آپ کے ساتھ اسی لئے تھی کہ آپ سے بڑے بڑے کام اس کو لینا منظور تھے۔ چنانچہ دنیا نے اس کو دیکھ لیا کہ آپ باوجود کمسن اور صنفِ نازک ہونے کے بڑے بڑے فقہا صحابہ سے علمی طور پر برتر تھیں۔

## دوسرا سوال اور اس کا جواب

دوسرا سوال جو اس موقع پر کیا جاتا ہے کہ ۹ برس کی لڑکی صحیح معنی میں دلہن بننے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتی۔ اس سوال کا جواب خود واقعات دینے کو تیار ہیں۔ اگر کسی کی نظر ہی وسیع نہ ہو تو اس کا کیا علاج ہے۔ ہم نے خود اپنے اس زمانہ میں بعض واقعات اس قسم کے سنے ہیں کہ فلاں مقام پر اس عمر کی کمسن لڑکی حاملہ پائی گئی یا اس کو وضع حمل ہوا ہے۔ اخبارات میں بھی ایسے واقعات شائع ہوتے رہتے ہیں۔ مگر ہم اس موقع پر ائمہ اسلام کی شہادت پیش کرنا چاہتے ہیں جنہوں نے یہ لکھا ہے کہ اس سن کی عورتیں حاملہ یا ذات الولد پائی گئیں چنانچہ دارقطنی جو حدیث کی مشہور کتاب ہے۔ اس میں عباد بن عباد مہلسی کا بیان مذکور ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ

أدرکت فینا یعنی المہالبا امرأة صارت جدة وهي بنت ثمان عشرة سنة ولد لتسع سنين ابنة فولدت ابنتها لتسع سنين فصارت هي جدة وهي بنت ثمان

عشرہ سنہ ..... الخ

”میں نے اپنی قوم مہالبہ میں ایک عورت کو دیکھا کہ وہ اٹھارہ برس کی عمر میں نانی بن گئی تھی۔ اس کی صورت یہ ہوئی کہ خود اس کو ۹ برس کی عمر میں لڑکی پیدا ہوئی اور پھر وہ لڑکی ۹ برس میں لڑکے والی ہو گئی اور اس طرح سے ۱۸ برس میں نانی بن گئی۔“

اصل یہ ہے کہ لڑکے لڑکیوں کا شباب و بلوغ صرف عمر ہی پر موقوف نہیں۔ زیادہ تر ملکی آب و ہوا اور جسمانی نشوونما کو بھی اس میں بہت کچھ دخل ہے۔ ایک ہی ملک کے قوی الاعضا اور نحیف الاعضا میں چار چار، چھ چھ برس کا فرق پڑ جاتا ہے حتیٰ کہ بعض اوقات چھوٹا لڑکا یا لڑکی بلوغ کو پہنچ جاتے ہیں اور بڑے ابھی برسوں پڑے رہ جاتے ہیں۔ امام شافعیؒ جو ائمہ اربعہ میں جلیل القدر امام ہیں، آپ کا چشم دید واقعہ نقل کیا جاتا ہے:

أنه رأى جدة بنت إحدى عشرين سنة وإنها حاضت لاستكمال تسع ووضعت بنتها لاستكمال عشر ووقع ببنتها مثل ذلك (فتح الباری: ص ۲۰۳ جلد ۵)  
”آپ نے دیکھا کہ ایک عورت اکیس برس کی عمر میں نانی بن گئی۔ اس کی صورت یوں ہوئی کہ نویں برس میں حیض آیا، دسویں برس میں لڑکی جنی اور اس لڑکی کا حیض و حمل بھی اسی طرح وقوع پذیر ہوا جس سے اکیس برس کی عمر میں نانی کہلانے لگی۔“

اسی طرح صحیح بخاری میں بھی حسن بن صالح کے ذریعہ ایک واقعہ مذکور ہے۔ ان کا بیان ہے کہ  
كنت أدركت جارة لنا جدة بنت إحدى وعشرين (بخاری: جلد ۱ ص ۴۶۶)  
”میں نے اپنے پڑوس کی لڑکی کو دیکھا کہ وہ اکیس برس کی عمر میں نانی ہو گئی تھی۔“

ان واقعات اور حالات کے معلوم کر لینے کے بعد غالباً اس عمر میں عورت کے بلوغ میں کسی کو شبہ نہیں ہو سکتا۔ ہاں یہ ہمیں بھی تسلیم ہے کہ علی العموم اس سن میں بہت کم عورتیں بالغ پائی جاتی ہیں مگر اس سے یکدم نفی کا ثبوت کیونکر ہو سکتا ہے اور خاص کر ایسی لڑکی کی نسبت جس کی جسمانی اور روحانی نشوونما کا کمال سب پر ظاہر ہو۔

ہاں ممکن ہے کہ کسی کو اس واقعہ سے شبہ پڑے کہ آپ کی کمسنی اور جھولا وغیرہ کا ذکر آپ کے بلوغ کو تسلیم کرنے سے مانع ہے تو اس کے جواب میں آپ کی توجہ عہد رفتہ کی طرف منعطف کرنے کا مشورہ دیں گے اور اس زمانہ کی سادگی اور معاشرتی حالات کی طرف غائر نظر ڈالنے کی رائے دیں گے، جس سے تمام شکوک رفع ہو جائیں گے۔

## تیسرا سوال اور اس کا جواب

اس موقع پر تیسرا سوال یہ ہے کہ کیا کوئی اور لڑکی اس سے زیادہ سن کی آپ کو نہیں مل سکتی تھی۔ اس

کے جواب میں گزارش ہے کہ ہاں ضرور مل سکتی تھی لیکن وہ فضل و کمال جو آپ کے شامل حال تھا، وہ کیونکر کسی اور میں مل سکتا تھا۔ آپ کو معلوم ہے کہ اُمّ المؤمنین حضرت عائشہؓ کے علاوہ اور بھی ۸، ۹ بیویاں آ حضرت ﷺ کی عقد میں تھیں۔ لیکن کوئی بیوی بھی آپ کے ہم پلہ نہیں ہوئی۔ ہم نے جو اوپر آپ کے حالات میں ائمہ کرام کے کلمات کو پیش کیا ہے، اس سے ہر شخص آپ کی قابلیت کا باسانی اندازہ لگا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی مسلمہ امر ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نہ صرف اہل اسلام میں معزز و محترم تسلیم کئے جاتے تھے بلکہ کفارِ عرب نے بھی ہمیشہ آپ کو عزت و احترام کی نظر سے دیکھا۔ چنانچہ آپ کا یہ واقعہ صحیح بخاری میں مذکور ہے کہ آپ اپنی قوم سے تنگ آ کر جب حبشہ کی طرف اول اول ہجرت کرنا چاہی تھی اور اس قصد سے آپ مکان سے نکل چکے تھے تو راستہ میں ’ابن دغنے‘ سردار قبیلہ آپ سے ملا۔ اور اسے جب یہ معلوم ہوا کہ آپ ترکِ وطن کر کے اور جگہ جانا چاہتے ہیں تو وہ آپ کو راستہ سے واپس لایا اور کہا کہ آپ جیسا شخص بھی قوم سے الگ کیا جاسکتا ہے؟

مقامِ غور ہے کہ کفارِ عرب جو دین اسلام کے سخت ترین دشمن اور مسلمانوں کے خون کے پیاسے تھے ایسی حالت میں ایک ایسے شخص کو جو اسلام کا سخت فدائی اور دین کا کامل جاں نثار ہے، اس کو ان کی قوم کا سردار راستہ سے واپس بلا رہا ہے۔ کوئی شخص اس واقعہ سے بخوبی اندازہ کر سکتا ہے کہ عرب میں آپ کس شان و شوکت اور عزت و وقار کے مالک تھے۔ اس سے یہ واضح ہے کہ عرب میں آپ کی شخصیت ایک بے نظیر شخصیت تھی اور مذہب اسلام میں تو اہل حق کا اس امر پر کامل اتفاق ہی ہے کہ

إِنَّ أَفْضَلَ النَّاسِ بَعْدَ الْأَنْبِيَاءِ بِالْتَّحْقِيقِ أَبُو بَكْرٍ الصِّدِّيقُ  
”یقیناً انبیاء کے بعد تمام انسانوں سے افضل ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں۔“

ایسے عظیم الشان اور معزز خاندان کی لڑکی جو خاندانی شرافت کے ساتھ ساتھ ہر قسم کے جسمانی اور روحانی محاسن سے بھی مالا مال ہو۔ کیا ایسی معزز خاتون بجز نبی کے کسی اور کے لائق ہو سکتی تھی۔ اور کیا کوئی دوسری لڑکی ان تبلیغی فرائض کی انجام دہی کر سکتی تھی۔

اس کے علاوہ ایک نہایت اہم مصلحت یہ بھی تھی کہ دنیا آگے چل کر یہ نہ کہہ سکے کہ ایسا اولوالعزم نبی باوجود متعدد نکاح و بیاہ کے کسی باکرہ لڑکی سے ہم آغوش نہ ہو سکا۔ جیسا کہ کفارِ عرب نے آپ کے سامنے آپ کے چچا ابوطالب کی معرفت آپ کو راہِ حق سے روکنے کے لئے آخری تدبیر پیش کرتے ہوئے کہا:

۱۔ آپ اگر حکومت چاہتے ہیں تو ہم آپ کو اپنا سردار تسلیم کرنے کو تیار ہیں۔ مگر آپ ہمارے مذہب کی تردید سے باز آجائیں۔

۲۔ اگر آپ مال چاہتے ہوں تو ہم تمام قبائل آپ کے لئے اس کا انتظام کر دیں گے۔ مگر آپ ہمارے

مذہب کی توہین نہ کریں۔

۳۔ اگر آپ ہماری لڑکیوں میں سے کسی لڑکی کو چاہتے ہیں تو آپ کو اختیار دیتے ہیں کہ اعیان قریش کے خاندان سے بہتر سے بہتر لڑکی منتخب کر سکتے ہیں، مگر ہمارے مذہب کی مخالفت نہ کریں۔ یہ وہ چیزیں تھیں جو آپ کو مذہب اسلام سے روکنے کے لئے آپ کے سامنے پیش کی گئی تھیں۔ مگر آپ نے اس کے جواب میں جو بیچا سے عرض کیا ہے، وہ تمام دنیا کے لئے مقام فکر ہے، فرمایا: ”اے بیچا! اگر میری قوم میرے ایک ہاتھ پر آفتاب اور دوسرے پر ماہتاب رکھ دے تو پھر بھی میں احکام الہی کی تبلیغ سے باز نہیں آ سکتا۔“

آپ کی اس ثبات قدمی اور اولوالعزمی کے صلہ میں خدا نے دولت حکومت کے ساتھ عرب کے بہترین سردار کی قابل ترین لڑکی کو بھی آپ کے عقد میں عطا فرمایا جس سے درج ذیل مصالح کی تکمیل باحسن وجوہ عمل میں آئی:

- (۱) مسلم خواتین کی اہم اور ضروری مصلحتیں آپ کے ذریعہ انجام پذیر ہوئیں۔
- (۲) آپ نے صنف نازک میں اس امر کا حوصلہ بتلایا کہ ایک لڑکی عقل و شعور سے کام لے اور محنت کرے تو علم و فضل میں نمایاں مرتبہ پا سکتی ہے۔
- (۳) نبی جس طرح اُخروی نعمتوں سے سرفراز ہوگا، دنیا بھی اس کی خواہش اور ارادہ سے زیادہ، اس کی خدمت کے لئے موجود تھی۔
- (۴) آپ کی عزت و شرافت کا معیار اس قدر اعلیٰ اور اہم تھا کہ عرب کا بڑے سے بڑا سردار اپنی کمسن بیٹی کو آپ کے عقد میں دے دینا بھی اپنے لئے باعثِ فخر سمجھتا تھا۔
- (۵) دنیا سے بے رغبتی آپ کی کسی مجبوری یا عاجزی پر منحصر نہ تھی بلکہ آپ کا زہد و تقدس آپ کو دنیا سے دور رکھے ہوئے تھا۔ ورنہ دنیا آپ کی تمام خواہشات کے لئے آپ کے قدم مبارک پر سرنگوں تھی۔

## مزید شبہات

متفق علیہ احادیث کی تکذیب کوئی معمولی گناہ نہیں ہے۔ انہی پر اسلام اور قرآنی احکام کا دارومدار ہے۔ اگر ایسی ہی ’درایت‘ سے آج روایتوں کی تکذیب ہونے لگے تو کل قرآن مجید بھی اسی نام نہاد ’درایت‘ کے قربان گاہ پر چڑھ جائے گا اور ساری دنیائے اسلام میں الحاد و نیچریت کا نقارہ بجنے لگے گا اور ہمارے اسلام کے پیچھے پڑی ہوئی قوم خود ہمارے ہاتھوں کا میاب ہو جائے گی۔

ہرچند کہ اس کے بعد کچھ بھی ضرورت باقی نہیں رہتی کہ اس کے متعلق کچھ مزید لکھا جائے مگر چونکہ

مضمون نگار حضرات نے اس خلاف واقعہ تحقیق پر اعتماد رکھتے ہوئے کچھ اور دلائل عقلیہ بھی لکھے ہیں جو بناء فاسد علی الفاسد ہونے کے علاوہ احادیث سے حد درجہ بدگمان کرنے والے ہیں۔ لہذا ان کی مزعومہ درایت پر بھی نظر ڈال لینا مناسب سمجھتے ہیں اور ان کے دلائل کا ذکر کرتے ہوئے ساتھ ساتھ جواب بھی لکھتے ہیں:

### مدعی کی پہلی دلیل اور اس پر تنقید

”حضرت خدیجہ الکبریٰؓ کی وفات سے حضور ﷺ کو تبلیغی تکلیفات کے علاوہ گھر کی ویرانی کی زیادہ تکلیف دہ تھی۔ خانہ داری کا انتظام تتر بتر ہو رہا تھا اور گھر میں بال بچوں کا سنبھالنے والا کوئی نہیں تھا۔ ایسے حالات میں ضروری تھا کہ گھر کے انتظام کے لئے ایک قابل جوان عورت ہونہ کہ ۶ برس کی بچی عائشہؓ کا نکاح جو اکثر راویوں کے نزدیک حضرت سودہؓ سے پہلے ہوا، اور بالفرض اگر یہی سچ ہو کہ سودہؓ ہی کا پہلے نکاح ہوا تو وہ بے چاری بڑھیا، بھاری بھر کم تھی جس کا ہلنا جلنا بھی مشکل تھا گھر کا کام کیا کر سکتی؟“

اس کے جواب میں عرض ہے کہ بلاشبہ حضرت خدیجہؓ اور ابوطالب کی وفات سے آپ کی اندرونی و بیرونی مشکلات میں اضافہ ہو گیا تھا اور خانہ داری کے انتظام کے لئے ایک قابل عورت کی بروقت ضرورت بھی تھی۔ لیکن اس کا ثبوت آپ کے ذمہ ہے کہ بوقت ضرورت حضرت عائشہؓ خانہ آباد بھی ہو گئی تھیں حالانکہ آپ خود پہلے لکھ چکے ہیں کہ ”ہجرت سے پہلے مکہ میں نکاح ہوا اور ہجرت کے دو سال بعد مدینہ میں رسول اللہ کے گھر میں آباد ہوئیں۔ پس آپ ہی بتلائیں کہ انتظام کی ضرورت تو بروقت مکہ میں ہو اور منتظمہ دو سال کے بعد گھر میں قدم رکھے۔ وہ بھی مکہ کے بجائے مدینہ میں۔ پھر تو ویران گھر ویران ہی رہا یا آباد ہو گیا۔ اب آپ حضرات کی وہ خانہ آبادی والی مصلحت اور بال بچوں کی نگرانی کی ضرورت کہاں گئی اور بالخصوص اس صورت میں کہ آپ حضرات نے حضرت سودہؓ کو حضرت عائشہؓ سے قبل گھر میں آنا ہی ممنوع قرار دے رکھا ہے جو خلاف تحقیق کے ساتھ ساتھ عقل کے بھی خلاف ہے۔

اصل یہ ہے کہ اولاً تو حضور ﷺ کے گھر کا انتظام کوئی بڑا بھاری انتظام نہیں تھا اور نہ زیادہ بال بچے۔ ایک حضرت فاطمہ کبریٰؓ جو بقول آپ کے ۱۶/۱۵ برس کی تھیں اور ایک آپ سے چھوٹی رضی اللہ عنہا اور بس۔ ثانیاً: جو کچھ بھی ہو انتظام کے لئے بال بچوں کی نگرانی کے لئے سن رسیدہ تجربہ کار عورت کی ضرورت ہوا کرتی ہے جس کو سب جانتے ہیں اور اس کے لئے حضرت سودہ بروقت کافی ہو گئیں۔ انہیں سے پہلے نکاح بھی ہوا اور یہی پہلے آباد بھی ہوئیں۔ طبقات ابن سعد صفحہ ۳۷ میں ہے کہ حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد آپ کے پاس حضرت عثمان بن مظعون کی بیوی خولہ آئیں اور کہا کہ حضور کو خدیجہؓ کی

وفات سے بہت صدمہ ہوا۔ آپؐ نے فرمایا:

أجل كانت أمّ العیال وربّة البیت ”ہاں وہ بچوں کی ماں اور گھر کی منتظمہ تھیں اور اب کوئی نہیں“ تب خولہؓ نے حضرت سودہؓ کے تجربہ کاری اور سن رسیدگی کا تذکرہ کر کے اجازت مانگی کہ اگر حکم ہو تو میں درمیان میں پڑوں۔ چونکہ آپؐ کو سردست ایسی ہی اہل بیت کی ضرورت تھی، آپؐ نے اجازت دی۔ بات پختہ ہو گئی، نکاح ہوا اور مکہ ہی میں خانہ آباد ہو گئیں۔

اس کے بعد حضرت عائشہؓ کی طرف خیال کیا گیا، اس لئے کہ آپؐ کو ازغیب بشارت ہو چکی تھی۔ چنانچہ آپؐ نے پیغام دیا اور اس وقت آپؐ کی عمر ۶ برس کامل ہو کر ساتویں برس میں داخل ہو چکی تھی (اسی وجہ سے آپؐ کی عمر کی بابت چھ برس اور کہیں سات برس کا ذکر آتا ہے) نہ اس وجہ سے کہ آپؐ سے گھر کا کام چلے گا بلکہ محض مبشر من اللہ ہونے کی وجہ سے (کذا فی الطبقات والا ستیعاب)۔ اس نکاح سے بشارتِ ربانی حاصل کرنا مطلوب تھا، نہ کہ خانہ آبادی۔ ہاں جن سے کام چلنے والا تھا، وہ خانہ آباد ہو گئیں یعنی حضرت سودہؓ اور روایت یہی صحیح ہے۔

بالفرض حضرت عائشہؓ ہی کے ساتھ پہلے نکاح ہونا مان لیا جائے اور وہ بھی بقول آپؐ کے زیادہ سے زیادہ سولہ برس کی عمر میں تو اس سے حضور ﷺ کا کیا کام چلا۔ کیونکہ ان سے تو گھر آباد ہوا مدینہ میں اور بروقت ضرورت تھی مکہ میں۔ پس ان سے پہلے نکاح ہوا تو کیا، نہ ہوا تو کیا ۶ کی عمر میں یا ۱۶ کی! ذی فہم باقی آپؐ کے یہ الفاظ کہ وہ بے چاری بڑھیا بھاری بھر کم جس کے لئے ہلنا جلنا بھی مشکل تھا، بھلا گھر کا کام کیا کر سکتی، خلاف تہذیب ہونے کے علاوہ کسی قدر خلاف واقعہ ہے۔ کیا نعوذ باللہ وہ اپانچ تھیں یا گھر میں کدال چلانی تھی۔ کیا حضورؐ کی دل دہی، گھر کے معمولی انتظام اور بچوں کی دیکھ بھال سے بھی قاصر تھیں۔ پھر تو حضورؐ نے ان سے نکاح کر کے اپنی مشکلات میں ایک اور مشکل کا اضافہ کر لیا۔

## دوسری دلیل اور اس پر تنقید

کتابوں میں لکھا ہے کہ بعض مرتبہ حضرت عائشہؓ اور حضرت فاطمہؓ میں مقابلہ کی گفتگو ہو جایا کرتی اور یہ صرف ہم عمروں میں ہی ہوا کرتی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ عائشہؓ کی عمر ہجرت کے وقت ضرور سترہ سال ہوگی۔

اس کے متعلق سوائے اس کے کہ آپؐ کے قوتِ استدلالیہ کی تعریف کروں اور کیا عرض کروں۔ اولاً تو حضرت فاطمہؓ الزہراؓ بحکم فاطمہ بضعة منی بالکل اپنے بزرگوار باپ سید المرسلین رحمۃ اللعالمین ﷺ کی نمونہ تھیں، وہ مقابلہ کی گفتگو کیا جانیں۔ ثانیاً: بالفرض تسلیم کر بھی لیا جائے تو ایسا ہونا لازمی نہیں۔ ثالثاً اس سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ حضرت عائشہؓ اور حضرت زینبؓ دونوں میں گاہے بگاہے (نہ ہونے کے

برابر) مقابلہ کی گفتگو ہو جایا کرتی تھی لہذا یہ دونوں بھی ہی ہم عمر ہوں واللزام باطل فاللزوجم مثله!

### تیسری دلیل اور اس پر تنقید

یہ ثابت ہے کہ عائشہؓ کی منگنی جبیر بن مطعم کے بیٹے کے ساتھ ہوئی تھی مگر ان لوگوں نے منگنی توڑ دی کہ ان کے آنے سے ان کے گھر میں اسلام کا قدم آجائے گا۔ یہ ظاہر ہے کہ اسلام کی تبلیغ ہجرت کے سال سے پہلے ہوئی تھی اس لئے ضروری ہے کہ منگنی اس سے بھی پہلے ہوئی ہوگی، الخ  
اولاً یہ غلط ہے کہ جبیر بن مطعم کے بیٹے سے ہوئی بلکہ خود جبیر سے ہوئی تھی۔ ثانیاً یہ بھی غلط ہے کہ مطعم بن عدی کی طرف سے منگنی توڑ دی گئی یہ اور بات ہے کہ ان لوگوں نے حمیت جاہلیت کی وجہ سے پہلو تہی برتی تھی مگر منگنی توڑی نہیں تھی۔ طبقات ابن سعد صفحہ ۳۵ میں ہے:

عن ابن عباس قال خطب رسول الله ﷺ إلى أبي بكر الصديق عائشة فقال أبوبكر يا رسول! قد كنت وعدت بها أو ذكرتها لمطعم بن عدی لابنه جبیر فدعني حتى أسئلها منهم ففعل ثم تزوجها رسول الله ﷺ  
ثالثاً کیا یہ ضروری ہے کہ سن تبلیغ سے پہلے منگنی ہوئی ہو۔ کیونکہ ان کو لڑکی لینی تھی، دینی نہیں تھی۔  
البتہ یہ کہئے کہ احکام نکاح کے نزول سے پہلے ہوئی ہوگی۔

### چوتھی دلیل اور اس پر تنقید

حضرت عائشہؓ کے علمی اجتہادات کا زور و شور سے اعلان کیا جاتا ہے۔ بلکہ ان کو نصف دین مانا گیا ہے۔ یہ کارنامے دس بارہ سال کے بچے سے نہیں ہو سکتے..... الخ  
اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ کہ دنیا کے اندر بچوں کی نشوونما میں قدرت کے اطوار مختلف ہیں۔ بعض بچے پیدا ہوتے ہی اپنے کمال سلامتی اعضا اور ہرے بھرے بدن اور قد و قامت کے لحاظ سے دیکھنے والوں کی نظر میں ایسے معلوم ہوتے ہیں کہ دیکھتے ہی لوگ اس کو مہینوں کی عمر کا تجویز کرتے ہیں اور بعض ایسے نحیف و لاغر ہوتے ہیں کہ مہینوں کی عمر پر بھی ایک ہفتہ کی عمر تجویز کرنے میں تامل کرتے ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس عقل و ذکا اور فہم رسا میں بھی بعض بچے ایسے ہونہار و ممتاز نکل جاتے ہیں کہ صغیر ہی سے ان کے فہم و ادراک کی مثالیں ملنے لگتی ہیں۔ یہ سب تو قدرتی آثار ہیں۔ پھر اگر وہ مولود کسی امیر اور علمی خاندان کا ہو تو اس کی نشوونما اور ترقی علم و فہم کا کیا پوچھنا ہے۔ حضرت عائشہؓ ام المومنین بھی اسی زمرہ کی ایک ممتاز فرد اور نمونہ قدرت تھیں۔ حضرت ابوبکرؓ کی امارت اور فقاہت کوئی مخفی چیز نہیں ہے اور پھر حضور سید المرسلین ﷺ سے انتساب و ازواج و معیت و فیض صحبت سب پر بالا بلکہ سونے پر سہاگہ ہو گیا جس سے ان کے جوہر عقل و ذکا میں ایسی جلا آ گئی اور عامہ و خاصہ تمام امور میں معاملہ فہمی کا ایسا ملکہ راسخہ حاصل

ہو گیا کہ اکابر صحابہ کرام بھی ان کے محتاج ہو گئے اور بڑے بڑے مسائل شرعیہ و سیاسیہ ان سے حاصل کرنے لگے بلکہ فرائض جو نصف علم مانا گیا ہے، اکابر صحابہ اس کے مسائل اسی کم عمر فاضلہ صدیقہؓ سے دریافت فرمانے لگے

قال مسروق والذي نفسي بيده لقد رأيت مشيخة أصحاب محمد ﷺ الأکابر يستلونها عن الفرائض (طبقات: صفحہ ۴۵)

”میں نے آنحضرت ﷺ کے بڑے بڑے جلیل القدر اصحاب کو دیکھا کہ وہ حضرت عائشہؓ سے فرائض کے مسائل دریافت کیا کرتے تھے“

قال عطاء كانت عائشة أفقه الناس وأعلم الناس وأحسن الناس رأيا في العامة قال هشام ما رأيت أحدا أعلم بفقہ ولا بطب ولا بشعر من عائشة

”حضرت عائشہؓ تمام لوگوں میں زیادہ سمجھدار اور سب سے زیادہ علم والی اور عام طور پر نہایت پختہ رائے رکھنے والی تھیں۔..... میں نے کسی کو حضرت عائشہؓ سے زیادہ عالم نہیں پایا۔ فقہ، طب، شعر ان میں سے کسی ایک میں بھی کوئی ان کا ہم پلہ عالم نہ تھا۔“ (استیعاب: صفحہ ۷۶۵)

## پانچویں دلیل اور اس پر تنقید

رسول اللہ ﷺ کے تمام اقوال اُمت کے لئے نمونہ ہیں، اس واسطے آپ کی پیروی سب کے لئے ہدایت کا ذریعہ ہے سو یہ بات بھی ظاہر ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ۶ برس کی بچی سے نکاح نہیں کیا۔ چھ برس کی بچی سے نکاح کرنا نہ عقلاً کوئی عیب ہے نہ شرعاً کوئی حرج:

أجمع المسلمون على جواز تزويجه بنته البكر الصغيرة لهذا الحديث

”حضرت عائشہؓ کی حدیث کہ چھ برس کی عمر میں حضور سے نکاح ہوا، سے تمام علماء نے اجماعی طور پر یہ مسئلہ نکالا ہے کہ باپ اپنی چھوٹی بچی کا نکاح اگر کر دے تو جائز ہے“ (مسلم شریف مع نووی)

اسی طرح اس مسئلہ کا انکشاف تمام کتب فقہ میں بھی موجود ہے۔

## چھٹی دلیل اور اس پر تنقید

یہ بات سب جانتے ہیں کہ ابتدا میں پیدائش کے وقت کوئی نہیں جانتا کہ مولود دنیا میں نامور ہوگا یا گننام۔ پھر دنیا میں رہ کر اپنی قابلیت سے نامور ہو جاتا ہے تو اس کا سن وفات اکثر صحیح اور پھر اس کی عمر کا حساب لگا کر سن پیدائش نکالا جاتا ہے جو اکثر غلط ہوتا ہے..... الخ

آپ کا مطلب ظاہر ہے کہ حضرت عائشہؓ کا سن وفات جو ۵۸ھ کتابوں میں لکھا ہے، وہ تو صحیح ہے مگر سن پیدائش غلط ہے۔ اس بنا پر حدیثوں میں جو عند النکاح چھ یا سات برس کی عمر مروی ہے، وہ بھی غلط ہے اور اُکمال کی سند کا یقین کرتے ہوئے اپنی کوتاہ نظر اور قصور فہمی سے ۱۶ برس کی عمر جو سمجھ لیا ہے، بس



وہی صحیح ہے باقی غلط۔ کیونکہ اس کے بعد آخر میں بطور نتیجہ کے آپ لکھتے ہیں

”ہم لوگ خوش اعتقادی سے راویوں کی اس بات پر آمنا و صدقنا تو کہتے ہیں مگر دل میں یہ بات ضرور کھٹکتی رہی۔ سو خدا کا شکر ہے کہ وہ کھٹکا دور ہو گیا۔ اب ناظرین کو اختیار ہے کہ راویوں کی بات مانیں یا ’اکمال‘ کی سند کا یقین کریں۔“

اس کے متعلق ہم زیادہ کہنا نہیں چاہتے۔ ہمیں بھی اکمال کی سند کا یقین ہے۔ بس آپ مہربانی کر کے ’اکمال‘ کے دونوں متعارض بیانوں کو ملا کر عند النکاح سولہ برس کی عمر پر چسپاں کر دیجئے۔ مگر یاد رکھئے کہ ایسا قیامت تک آپ نہ کر سکیں گے!

وإن كنت تدري فالمصيبة أعظم

فإن كنت لا تدري فتلك مصيبة

علم وادب کے مرکز لاہور سے بیس سال سے شائع  
ہونے والا پاکستان کا مقبول ترین علمی و تحقیقی مجلہ  
علماء، دانشور، وکلاء، خطباء، طلباء  
اور اہل فکر و نظر کی اولین پسند

ماہنامہ سُنَّات لاہور

☆ ۳ سال سے نئی آب و تاب کے ساتھ ہر ماہ باقاعدہ شائع ہو رہا ہے ☆

خوبصورت کمپوزنگ، معیاری سفید کاغذ، دیدہ زیب طباعت، ۷۲ صفحات

ہر شمارے میں ۵ سے زائد اہم مضامین جن میں سے ہر ایک اپنے موضوع پر مکمل کتابچہ ہے

قومی امور پر اسلامی نقطہ نظر، کتاب و سنت، فقہ و اجتہاد، ایمان و عقائد اور دارالافتاء کے مستقل سلسلے

اسلام اور جدید مغربی افکار پر ہر ماہ اہم مضامین..... نامور محققین، معروف علماء کی تحریریں

عالم اسلام کی علمی تحریکوں کا تعارف و تبصرہ اور منتخب عربی مضامین کے تراجم

محدث میں شائع ہونے والے مضامین اکثر دینی جرائد اور اخبارات دوبارہ شائع کرتے ہیں!

جدید سودی نظریات اور اسلام، جادو کے شرعی توڑ، اسلام کے لئے کمپیوٹر کے استعمالات،

مغربی تحریک نسواں وغیرہ کے موضوعات پر محدث کے مضامین منفرد اہمیت رکھتے ہیں!

بنک اکاؤنٹ: ماہنامہ محدث یونائیٹڈ بینک لمیٹڈ، ماڈل ٹاؤن کراسنگ، اکاؤنٹ نمبر ۹۸۳

منی آرڈر بھجوانے یا نمونہ منگوانے کے لئے ۴ روپے کا کٹکٹ لگا کر

ماہنامہ محدث، ۹۹ جے ماڈل ٹاؤن، لاہور ۵۴۷۰۰ پر پوسٹ کریں

[www.KitaboSunnat.com](http://www.KitaboSunnat.com)

محمود بن محمد المختار شنگیتلی  
مترجم: محمد اسلم صدیق\*

اسلام اور انسانی حقوق

## حقوق انسانی..... شریعت کی میزان میں!

### اسلام اور انسانی حقوق

آج ہر طرف انسانی حقوق کا چرچا ہے اور حقوق انسانی کا موضوع ہر شخص کی زبان کا ورد، وقت کی آواز اور عالمی دلچسپی اور توجہ کا مرکز بن گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج ملکی اور بین الاقوامی سطح پر انسانی حقوق کے نام پر بڑی بڑی کانفرنسیں منعقد اور قراردادیں پاس ہو رہی ہیں، حتیٰ کہ حقوق انسانی کا نفاذ اس امر کو جانچنے کا معیار سمجھا جانے لگا ہے کہ ایک حکومت کس حد تک عدل و انصاف کے اصولوں کا التزام، اپنے باشندوں کے حقوق کی حفاظت اور ان کی آزادی کا پاس رکھتی ہے۔ بلکہ حقوق انسانی کا نفاذ جمہوری نظام کا ایک اہم عنصر سمجھا جاتا ہے جس طرح کہ جمہوریت پسندوں کا یہ کہنا ہے کہ جمہوریت سے مراد دراصل انسانی حقوق کی تائید و حمایت ہے۔

آج جب انسان قانون الہی سے دستبردار ہو چکا ہے اور اپنے خود ساختہ نظام کے سایہ عافیت میں پناہ ڈھونڈ رہا ہے تو ہم بغیر کسی تردد کے یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس طرح انسان ایک ایسے جامع نظام اور دائمی سہارے سے ہاتھ دھو بیٹھا ہے جو اس کے حقوق کا حقیقی محافظ اور ترقی کا ضامن تھا اور ایک ایسے قانون سے محروم ہو گیا ہے جسے نہ زمانہ کی گردشیں بوسیدہ کر سکتی ہیں، نہ حالات کی کروٹیں اسے زنگ آلود کر سکتی ہیں بلکہ وہ آج بھی ویسے ہی قابل عمل ہے جیسے ۱۴ سو سال پہلے تھا۔ اس دعویٰ کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ انسانی تاریخ کا کوئی بھی قانون اور نظام ان انسانی حقوق کو دوسروں پر نافذ نہ کر سکا لیکن اسلام وہ واحد نظام حیات ہے جس نے سب سے پہلے بڑی صراحت اور وضاحت کے ساتھ ان حقوق کا ذکر کیا، ان کا جامع تصور دیا اور انہیں دوسروں پر نافذ کر کے دکھایا۔ تاریخ شاہد ہے کہ جب تک اسلامی حکومت کا قیام رہا، حقوق انسانی کا نفاذ جاری و ساری رہا اور اسلامی نظام حکومت کے زیر سایہ کسی حق کا دامن بھی پامالی کے داغ سے آلودہ نہیں ہوا۔ کسی نے خوب کہا:

ولما حکمتہم سال بالدم أبطح

حکمنا فکان العدل منا سجيةً

”ہم نے حکومت کی تو انصاف ہمارے انگ انگ میں بسا ہوا تھا۔ اور جب تمہاری حکومت تھی تو

وادی بطاخون سے بہہ پڑی تھی۔“

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ انسانی حقوق کا ایشو ایک میدانِ جنگ کا روپ دھار چکا ہے جہاں اسلام اور مغرب کے درمیان شدید نظریاتی اور فکری جنگ بھڑک اٹھی ہے۔ شاید آتشِ جنگ کے یہ شعلے اس قدر شدید نہ ہوتے، اگر اہل مغرب ہماری فقہی میراث سے تغافل یا تجاہل کا مظاہرہ نہ کرتے۔ یا اس کا سبب وہ گمراہ کن خیالات ہیں جو رائے عامہ اور اسلام کے درمیان دیوارِ حائل کرنے کے لئے مستشرقین کی طرف سے وسیع پیمانے پر پھیلانے گئے۔ یا وہ اس بات کو بھول گئے کہ انہوں نے خود اسلامی تہذیب سے بہت زیادہ استفادہ کیا تھا اور انہوں نے اپنی تہذیب کی بنیاد انہی علوم پر استوار کی تھی جو مسلمانوں سے حاصل کئے تھے اور یہی وہ بنیاد تھی جس نے یورپ کی خاموش علمی فضا میں حرکت پیدا کر دی تھی<sup>(۱)</sup>۔ لیکن حیرت ہوتی ہے کہ وہ اصول جو ہم نے صدیاں ہوئیں، دنیا کے سامنے واضح کئے تھے، آج انہیں اُصولوں کا درس ہمیں دیا جاتا ہے، گویا یہ نئی انسانی دریافت ہے اور ہم آج تک اس سے واقف نہیں تھے۔

ہم اس میراث کے مالک ہیں جس نے دنیا کو وہ سنہری اُصول، شاندار روایات اور اعلیٰ اقدار بخشیں کہ آج تک کوئی قوم اس کی نظیر پیش نہیں کر سکی اور نہ کر سکتی ہے۔ کیا یہ مقامِ حیرت نہیں کہ وہ مغرب جو کبھی انسان اور حیوان کے فرق سے نا آشنا تھا، آج ہمیں جسمانی صفائی اور ہاتھ پاؤں، چہرہ دھونے کی تعلیم دے رہا ہے۔ اگر آپ ان سے کہیں کہ اس کے لئے تو اسلام نے ہمیں وضو کی تعلیم دی ہے تو احساسِ برتری کا شکار اور خود سری میں مبتلا یہ مغربی آپ سے کہیں گے کہ تم اپنی پسماندگی اور ہماری ترقی، اپنی کمتری اور ہماری برتری، اپنی فقری اور ہماری امیری کا اعتراف کیوں نہیں کر لیتے؟

حقیقت یہ ہے کہ جب قرونِ اخیرہ میں مسلمان بدترین سستی و کمالی کا شکار ہو گئے، مسلمانوں نے غفلت کی چادریں تان لیں تو نتیجہ یہ ہوا کہ ہماری عظیم علمی میراث جو ہم نے اسلاف سے پائی تھی، یورپ کے لئے مالِ غنیمت بن گئی۔ انہوں نے پہلے تو بے دردی سے ہماری میراث کو لوٹا پھران غاصبوں نے بدترین بددیانتی کا ارتکاب کرتے ہوئے اس سے ہمارے تمام تر نشانات مٹا کر اپنے نام کا لیلبل لگا

(۱) یورپ کا دورِ احیاء علوم مسلمانوں کے علوم و فنون کا ہی شرمندہ احسان ہے۔ جب مسلمانوں نے مغرب کی سرزمین سین اور سسلی میں قدم رکھا اور ان علاقوں کو فتح کیا تو یہ صرف ایک ملک یا جزیرہ کی فتح نہ تھی بلکہ تہذیب و تمدن اور علوم و فنون کے ایک نئے اور انقلاب آفریں دور کا آغاز تھا۔ ایسا دور جس نے بقول مشہور فرانسیسی مستشرق پروفیسر میس نیون، تہذیبی اعتبار سے یورپ کو بیدار کیا اور مغرب کی ترقی کے لئے نئے امکانات پیدا کر دیئے۔ عربوں کے علوم کو حاصل کرنے، ان کی مذہب کی حقیقت کو سمجھنے اور ان کی علمی سر بلندی کا راز دریافت کرنے کا جذبہ اس بات کا محرک ہوا کہ اسلام کا حقیقی مطالعہ کیا جائے۔ (مستشرقین کے افکار و نظریات کے مختلف دور از پروفیسر خلیق احمد نظامی) مترجم

دیا۔<sup>(۲)</sup> اس کے بعد یہ پروپیگنڈہ کیا گیا کہ اہل عرب نے دنیا کے لئے خیر کا کوئی کام نہیں کیا اور اسلام اور اس کو ماننے والے علمی لحاظ سے تہی دست ہیں۔ مسلمانوں نے علمی میدان میں کوئی قابل ذکر کارنامہ انجام نہیں دیا۔ لعنت ہو، ایسے خیانت کار دروغ گو ظالموں پر!

﴿لَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى الظَّالِمِينَ الَّذِينَ يَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ وَيَبْغُونَهَا عِوَجًا وَهُمْ بِالْآخِرَةِ كَافِرُونَ﴾ (الاعراف: ۴۴، ۴۵) ”خدا کی لعنت ہوان ظالموں پر جو اللہ کے راستے سے لوگوں کو روکتے اور اسے ٹیڑھا کرنا چاہتے ہیں اور آخرت کے منکر ہیں۔“

(حقوق الانسان بين تعاليم الاسلام وإعلان الأمم المتحدة از شيخ محمد الغزالي)

یعنی انسانی حقوق اسلامی تعلیمات اور اقوام متحدہ کے چارٹر کے تناظر میں، صفحہ ۶ تا ۱۰ کا خلاصہ)

مغرب کو چاہئے کہ وہ انسانی حقوق کے چارٹر میں دوسری اقوام..... خصوصاً وہ اقوام جو سیاسی، عسکری، اقتصادی اور ثقافتی بحران کا شکار ہیں..... کے عقیدہ، زبان، تہذیب و ثقافت اور ان کی فکر کے مختلف انفرادی اور اجتماعی لوازمات کی آزادی کا بنیادی حق تسلیم کر لے۔ اس کے بعد جن مختلف میدانوں میں ترقی کی معراج پر وہ خود پہنچ چکا ہے، اسے یہ حق دوسروں کے لئے بھی تسلیم کر لینا چاہئے۔ لیکن خود دوسرے مغرب جو اپنے آپ کو انسانی حقوق کا محافظ، اجارہ دار اور ٹھیکیدار سمجھتا ہے، ان قوموں کے حقوق کے حصول کے راستے میں اس طرح دشواریاں اور مشکلات کھڑی کر رہا ہے کہ ان مجبور اقوام کے مناسب اور جائز مقاصد اور حقوق بھی ناقابل حصول ہو کے رہ گئے ہیں۔ حتیٰ کہ یہ ممالک امریکہ اور یورپی ممالک کے ریغمال اور دست نگر بن کر رہ گئے ہیں، ان کی قسمت کا فیصلہ ان ظالموں کے ہاتھ میں ہے اور وہ ان اقوام کو معاشی، تعلیمی، علاج معالجہ اور امن و امان کے تمام چھوٹے بڑے حقوق سے محروم کر رہے ہیں۔

(۲) جب اسلامی ممالک پر سامراجی طاقتیں قابض ہو گئیں تو انہوں نے ان ملکوں پر اقتدار کے بچوں کو مضبوط کرنے کے لئے یہ ضروری سمجھا کہ مسلمان کی تاریخ کے پیچ و خم، ان کے افکار و احساسات کی ایک ایک خلش اور ان کے سماجی رجحانات اور دینی شعور کے ایک ایک نشیب و فراز کا پتہ لگایا جائے۔ کیونکہ ان کے دل و دماغ تک پہنچے بغیر قبضہ کو برقرار رکھنا ممکن نہ تھا۔ اس مقصد کو بروئے کار لانے کے لئے یونیورسٹیوں کا قیام عمل میں لانے کے بعد ان میں عربی پڑھانے کا بندوبست کیا گیا۔ اور اسلام کے علمی ذخائر کو سمیٹ سمیٹ کر لانے کے منصوبے بنائے گئے۔ آکسفورڈ کے عربی کے پروفیسر ایڈورڈ پوکاک Edward Pocock نے ’حلب‘ سے عربی مخطوطات کے بیش بہا ذخیرے حاصل کئے اور عربی تصانیف کے خلاصے کرنے شروع کر دیئے۔ نپولین نے ۱۷۹۸ء کے بعد مصر کے علمی ذخیروں کو فرانس منتقل کرنا شروع کر دیا۔ انگریزوں نے ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان کے نادر قلمی نسخے لندن پہنچا دیئے۔ انڈونیشیا، ہندوستان، ایران، مصر، شام اور عراق کے کتنے ہی انمول موتی جن کو غیر ملکوں میں دیکھ کر بقول اقبال ’دل سی پارہ ہوتا ہے‘، یورپین کتب خانوں کی زینت بن گئے۔ (مستشرقین کے افکار و نظریات کے مختلف دور، از پروفیسر خلیق احمد نظامی) مترجم

ان حالات میں مسلمانوں کے لئے سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ وہ اس بات سے آگاہ ہوں کہ اسلام نے حقوق انسان کا جو تصور پیش کیا ہے، وہ کوئی خصوصیات کا حامل ہے جو اسے باقی دنیا کے قوانین پر ممتاز کرتی ہیں اور کون سے وہ اصول اور اقدار ہیں جن پر یہ دستور مشتمل ہے، تاکہ مسلمان یہ جان لیں کہ انسانی حقوق کے موجودہ چارٹر پر نظر ثانی کی شدید ضرورت ہے اور اس کے بعد ہی وہ دیگر اقوام کو متنبہ کر سکتے ہیں کہ موجودہ چارٹر نظر ثانی اور تشکیل نو کا شدید تقاضی ہے اور ایک ایسا چارٹر دنیا والوں کے سامنے پیش کیا جانا چاہیے جو ہر لحاظ سے مکمل اور منظم ہو۔

پھر اسلام نے بنیادی انسانی حقوق کا جو جامع دستور دیا ہے، اس کو عالمی سطح پر نافذ کرنے اور دوسروں کو اس دستور کا قائل کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ مسلمان ان حقوق کو دنیا کے سامنے واضح کرنے کے بعد خود ان حقوق کو نافذ کر کے دکھائیں۔ یقیناً ہمارا یہ عملی اقدام اسلام کو رجعت پسند اور جنگجو ثابت کرنے والوں کا منہ بند کرنے کے لئے ایک بہترین کوشش ہوگی۔

شریعت اسلامیہ میں انسانی حقوق کا کیا تصور ہے؟ یہ موضوع نہایت دلچسپ اور کئی پہلوؤں کا حامل ہے۔ لیکن ہم اس موضوع کو صرف دو پہلوؤں پر منحصر کریں گے:

۱۔ شریعت اسلامیہ میں انسانی حقوق کی خصوصیات

۲۔ وہ انسانی حقوق جن میں شریعت اسلامیہ منفرد ہے

## (۱) اسلام میں انسانی حقوق کی خصوصیات

(۱) اسلام میں انسانی حقوق کے تصور کی سب سے بڑی خوبی جو اسے دیگر تصورات سے ممتاز کرتی

ہے، اس اصول پر مبنی ہونا ہے کہ حاکمیت اور اقتدار اعلیٰ کا مالک فقط اللہ تعالیٰ ہے۔ فرمان الہی ہے

﴿إِنَّ الْحُكْمَ إِلَّا لِلَّهِ يَقْضُ الْحَقَّ وَهُوَ خَيْرُ الْفَاصِلِينَ﴾ (الانعام: ۵۷) ”حکم تو بس

اللہ ہی کے لئے ہے وہی حق کی باتیں بیان کرتا ہے اور وہی سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔“

دوسری جگہ فرمایا: ﴿أَلَا لَهُ الْحُكْمُ وَهُوَ أَسْرَعُ الْحَاسِبِينَ﴾ (الانعام: ۶۲)

”اس بات کو فراموش نہ کرنا کہ حکم اسی (اللہ) کا حکم ہے اور حساب لینے والوں میں اس سے جلد

حساب لینے والا کوئی نہیں۔“

پس اسلام کا انسانی حقوق کا دستور کائنات کو الہیاتی نظر سے دیکھتا ہے۔ وہ یہ دیکھتا ہے کہ کون سی چیز انسان کے لئے نفع رساں ہے اور کون سی ضرر رساں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿إِنَّا هَدَيْنَا السَّبِيلَ إِمَّا شَاكِرًا وَإِمَّا كَفُورًا﴾ (الانسان: ۳)

”بے شک ہم نے انسان کی راہنمائی سیدھے راستے کی طرف کردی۔ اب اس کو اختیار ہے کہ

شکر گزار رہے یا ناشکر! بن جائے۔“

(۲) اسلام میں انسانی حقوق کی دوسری نمایاں خوبی ان کا دوام اور استحکام ہے۔ حالاتِ زمانہ کی گردشیں ان پر اثر انداز نہیں ہو سکتیں۔ علما نے جو حق کی تعریف کی ہے، اس سے اسلامی انسانی حقوق کی یہ فوقیت اور افضلیت کھل کر سامنے آ جاتی ہے: هو الحق الثابت الذی لا یجوز إنکارہ ”حق سے مراد وہ مسلمہ صداقت و واقعیت ہے جس سے انکار نہیں ہو سکتا۔“

یہ مسلمان دانشور ہی تھے جنہوں نے سب سے پہلے حقوق و فرائض کی تعریف کی اور ان کا دائرہ کار متعین کیا۔ (مشروعیۃ الحقوق و آدابہا: ص ۲۵)

(۳) اسلام میں انسانی حقوق کی بنیاد احسان پر رکھی گئی ہے۔ اسلام میں انسانی حقوق ایسے چشمہ صافی سے پھوٹتے ہیں، جہاں ایک بندے کو ہر وقت اللہ کا خوف دامن گیر رہتا ہے۔ جہاں ہر وقت، ہر لمحہ انسان کو یہ خیال رہتا ہے کہ وہ خدا کو دیکھ رہا ہے یا خدا اسے دیکھ رہا ہے۔ ظاہر ہے اس مقام پر کھڑا ہو کر انسان حقوق کی پامالی کا تصور بھی نہیں کر سکتا اور اس مقام احسان کی تعریف نبیؐ نے یوں بیان فرمائی ہے:

”أَنْ تَعْبُدَ اللَّهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ فَإِنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَإِنَّهُ يَرَاكَ“ (بخاری: حدیث ۵۰)

”تو اس طرح اللہ کی عبادت کر جیسے تو اللہ کو دیکھ رہا ہے۔ اگر تو اللہ کو نہیں دیکھ سکتا تو کم از کم یہ

تصور ضرور ہو کہ خدا تجھے دیکھ رہا ہے۔“

(۴) پھر اسلام نے انسانی حقوق کا جو تصور دیا ہے، اس کے درمیان اور اس دین کی فطرت کے درمیان مکمل یکجہتی، یکسانیت اور ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ اسلام نے حقوق کو یوں ہی مطلق اور بے مہار نہیں چھوڑ دیا بلکہ ان کے اوپر احکام شریعت اور مقاصد شریعت کا فریم چڑھایا، ان کو آداب، اخلاق اور دین کا پابند بنایا اور پھر ان آداب اور اخلاقیات اور دین کی پامالی کو انسانی حقوق کی پامالی قرار دیا۔ گویا اسلام نے تمام حقوق کو الہی بنیادوں پر استوار کیا ہے اور اس بنیاد کو مکمل طور پر فطرت ربانیہ یعنی فطرت اسلام سے ہم آہنگ اور مربوط کر دیا ہے۔ (مشروعیۃ الحقوق و آدابہا: صفحہ ۲۵)

(۵) پانچویں خصوصیت یہ ہے کہ اسلام میں حقوق انسانی کی بنیاد اس اصول پر قائم ہے کہ معاشرہ کی بالادستی فرع اور افراد کی بالادستی اصل ہے۔ معاشرہ کی بالادستی کو اصل اور فرد کی بالادستی کو اس کے تابع قرار دینا اسلام کی رو سے غلط ہے۔ لیکن دور حاضر کے انسان کا خود ساختہ نظام اسی اصول کا مرہونِ منت ہیں۔ (انسانی حقوق کا بہترین محافظ کون: اللہ یا انسان؟ از محمد سعید رمضان البوطی: صفحہ ۱۲، ۱۳)

چنانچہ فرمانِ الہی ہے:

﴿مِنْ أَجْلِ ذَلِكَ كَتَبْنَا عَلَى بَنِي إِسْرَائِيلَ أَنَّهُ مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ

فِي الْأَرْضِ فَكَانَ قَتْلَ النَّاسِ جَمِيعًا وَمَنْ أَحْيَاهَا فَكَانَ أَحْيَا النَّاسِ جَمِيعًا ﴿١٦٦﴾  
 ”اسی وجہ سے ہم نے بنی اسرائیل کے لئے (تورات) میں لکھ دیا تھا کہ جس شخص نے کسی انسان کو جان کے بدلہ کے علاوہ یا زمین میں فساد برپا کرنے کی غرض سے قتل کیا تو گویا اس نے سب انسانوں کو قتل کر دیا اور جس نے کسی کو (قتل ناحق) سے بچا لیا تو وہ گویا سب لوگوں کی حیات کا موجب ہوا۔“ (المائدہ: ۳۲)

(۶) پھر یہ خوبی کیا کم ہے کہ اسلام نے اس وقت یہ حقوق دنیا کو دیئے، جب یورپ تو مکمل اندھیرے میں تھا ہی، ایران و روم جیسی روشن خیال ریاستیں بھی ان حقوق سے نا آشنا تھیں۔ پھر یہ حقوق جو اسلام نے انسان کو عطا کئے، کسی فکری کشمکش، انقلاباتِ زمانہ اور تحریکوں کے دباؤ کے نتیجے میں ظہور پذیر نہیں ہوئے، بلکہ اسلام میں حقوقِ انسانی کے تمام اصول و احکام چودہ سو سال قبل وحی الہی کے چشمہ صافی سے پھوٹے تھے اور اس سے پہلے کوئی انسان بھی ان اصولوں سے آشنا نہیں تھا لیکن تاریخ شاہد ہے کہ فرانس اور برطانیہ میں انسانی حقوق کے شعور نے مختلف تحریکوں اور انقلابات کے لطن سے جنم لیا، وگرنہ یہ لوگ اس سے قبل حقوقِ انسانی کی ابجد سے بھی واقف نہیں تھے۔

## اسلام میں انسانی حقوق کی بعض منفرد اور امتیازی خصوصیات

مجموعی لحاظ سے ان حقوق کی بازگشت انسانی حقوق کی ان بے شمار قراردادوں کے ضمن میں سنائی دیتی ہے، جو اسلامی پلیٹ فارم پر انسانی حقوق کے حوالے سے پاس ہوئیں۔ ان میں سرفہرست حقوق مندرجہ ذیل ہیں:

- (۱) اسلام کی رو سے تمام انسان مساوی ہیں۔ اگر کسی کو کسی انسان برتری اور کوئی مقام حاصل ہے تو وہ عمل اور عقیدہ کی بنیاد پر ہے۔
- (۲) جنگ کے دوران بے گناہ افراد بوڑھوں، عورتوں اور بچوں کے تحفظ کا حق اور زخمیوں کی دیکھ بھال کا حق، قیدیوں کے حقوق، مقتولین کے مشلہ کی حرمت، یہ سب ایسے حقوق ہیں کہ انسانی حقوق کا عالمی چارٹر ان حقوق سے یکسر خالی ہے۔ ہاں بعض بین الاقوامی معاہدوں اور قراردادوں میں ان کا ذکر ملتا ہے مثلاً جینوا کا معاہدہ ہے۔ اسی طرح اقتصادی، اجتماعی، تمدنی و ثقافتی اور سیاسی حقوق کے حوالہ سے منعقد ہونے والی بعض کانفرنسوں میں ان کا ذکر ہے جن کی حیثیت کاغذ کے ٹکڑوں سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔
- (۳) دورانِ جنگ فضلوں کو تباہ کرنے اور شہری عمارتوں کو گرانے کی ممانعت انسانی حقوق کے تحفظ کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

- (۴) اہل خانہ کے لئے کفالت کا حق۔ یعنی اسلام گھر کے سربراہ پر فرض عائد کرتا ہے کہ وہ افرادِ خانہ کی کفالت کا بندوبست کرے۔
- (۵) ماں کے پیٹ میں پرورش پانیوالے بچے کے حقوق کا تحفظ۔ یعنی اگر خاوند اپنی حاملہ بیوی کو طلاق دے دیتا ہے تو اس جنین کی وجہ سے جو ماں کے پیٹ میں ہے، خاوند مطلقہ عورت کے نفقہ کا ذمہ دار ہوگا۔
- (۶) اولاد کے ذریعے والدین کے حقوق کا تحفظ کیا۔
- (۷) رشتہ داروں کے باہمی حقوق کا تحفظ۔
- (۸) اسلام نے تعلیم کو ہر فرد کا لازمی حق قرار دیا تاکہ دینی اور دنیاوی ہر لحاظ سے اس کی تربیت ہو سکے۔ اور پھر اس حق کو اس قدر تفصیل اور تاکید کے ساتھ بیان کیا کہ انسانی حقوق کا عالمی چارٹر اس کے مقابلے میں کچھ بھی حیثیت نہیں رکھتا۔
- (۹) خود مختاری اور استعماری زنجیروں سے آزادی کا حق۔ عالمی چارٹر میں اس کا ذکر مختلف نوعیت کا ہے
- (۱۰) کسی بھی جائز ذریعہ معاش کو اختیار کرنے کا حق اور سود لینے کی مخالفت۔
- (۱۱) اچھے کاموں کی طرف دعوت دینے اور برے کاموں سے روکنے کا حق یعنی آزادی تقریر و تحریر کا حق
- (۱۲) فرد کے لئے اپنے مقدمات کی توہین پر احتجاج کا حق۔

## حقوق انسانی کا نعرہ مغرب کے ہاتھ میں ایک سیاسی ہتھیار ہے!

یہ بات آپ پر مخفی نہیں کہ انسانی حقوق کے حوالے سے دیگر نظریات کے برعکس اسلام اپنی ساری توجہ انسان کے جذباتی شعور کو بیدار کرنے اور جھنجھوڑنے پر مرکوز کرتا ہے کہ وہ اللہ کی واحد ذات پر ایمان لے آئے اور اسی کو اپنا حاکم اور مقتدرِ اعلیٰ مان لے اور اس کے ساتھ یہ بات بھی ذہن نشین کروادینا چاہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس نظامِ حیات میں روئے ارض پر بسنے والی ہر مخلوق کو مکمل طور پر ایک منظم اور مربوط شکل میں انسانی مصالح کا تابع اور مطیع بنا دیا ہے۔

اسی طرح انسانی حقوق کے حوالہ سے مغرب اسلام پر جو اعتراضات وارد کرتا ہے، اس سے یہ بات کھل کر سامنے آگئی ہے کہ اصل جھگڑا کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ آج مغرب جملہ حقوق کا ٹھیکیدار بن کر اس مسئلے کو ہر اس قوم اور ملک کے خلاف ہتھیار کے طور پر استعمال کرنا چاہتا ہے جہاں اس کے سیاسی اور معاشی مفادات خطرے میں ہوں۔ جہاں ایسا نہ ہو تو اس کے نزدیک کہاں کے حقوق اور کہاں کا انسان؟ اسلام میں انسانی حقوق نہایت واضح اور حقائق پر مبنی ہیں اور انسانی زندگی سے ان کا گہرا تعلق ہے پھر یہ حقوق انسانی ضروریات کو اپیل کرتے ہیں، لیکن اس کے برعکس غیر اسلامی قوانین میں حقوق ازم فلسفہ



کے رنگ میں رنگا ہوا اور کاغذ کا وہ ٹکڑا ہے جسے کارگاہِ عمل میں پورا کرنا کسی طور ممکن نہیں۔ اس لئے آپ دیکھ رہے ہیں کہ مغرب نے انسانی حقوق کے حوالے سے جتنا بھی سفر کیا ہے، وہ اس لئے رائیگاں جا رہا ہے کہ اس نے انسان کے حقوق واضح تو کر دیئے لیکن ان کے پاس وہ قوت نافذ نہیں ہے جس کے ذریعے ان حقوق کو کارگاہِ عمل میں لایا جاسکے۔<sup>(۳)</sup>

اور یہ واقعہ ہے کہ مغرب کی پوری سیاسی تاریخ ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے جو چیخ چیخ کر اس بات کی گواہی دے رہے ہیں کہ ان انسانی حقوق کو نافذ کرنا تو دور کی بات، مغرب نے کبھی بھی ان مصالحِ اقدار و روایات اور حدود و قیود کی پابندی نہیں کی جو انسانی حقوق کے نفاذ میں مدد و معاون ہو سکتے تھے۔ اس لئے مغرب نے انسانی حقوق کے حوالہ سے جتنا بھی سفر کیا ہے، وہ سب رائیگاں ہے۔ مغربی حلقوں کی طرف سے مذہبی فسادات کے خطرہ کو پس پشت رکھ کر سلمانِ رشدی کی کتاب و سبعِ پیانہ پر شائع کر کے جو مسلمانوں کے جذبات کو جو ٹھیس پہنچائی گئی، آخر یہ کیا ہے؟ فلسطین اور کشمیر میں استعمار کے خلاف آزادی کی جنگ لڑنے والوں کو دہشت گرد قرار دینا یہ سب کچھ کیا ہے؟ تمہیں علم ہوگا کہ جب ۱۵/۱ امریکی قیدیوں کو لبنان میں بند کر دیا گیا تو مغربی دنیا کس طرح چیخ اٹھی تھی، کیوں؟ اس لئے کہ ان کا تعلق گوروں کی نسل سے تھا۔ دوسری طرف اسرائیل کے عقوبت خانوں میں آج بھی ۱۰ ہزار سے زائد فلسطینی سسک سسک کر دم توڑ رہے ہیں، لیکن خود سری میں مبتلا مغرب اور امن کا نام نہاد محافظِ امریکہ خاموشی سے یہ سارا تماشا

(۳) لہذا مشہور ماہرِ قانون سر ہرٹش لایٹر پاش Sir Hertch Laiter Pathit نے انسانی حقوق کے چارٹر پر تنقید کرتے ہوئے کہا کہ جب تک حقوقِ انسانی کو قانون بین الملک سے منسلک نہیں کیا جائے گا۔ ان کی حیثیت کاغذ کے ٹکڑوں کے سوا کچھ نہیں۔ اسی طرح انسانی حقوق کے چارٹر کے مشہور مسودہ نگار Franklin O-Roosevelt نے یہ تسلیم کیا کہ ”حقوقِ انسانی کا اعلان کوئی معاہدہ نہیں ہے۔ یہ اعلان کسی قانون کی وضاحت نہیں کرتا۔ ۴ نومبر ۱۹۴۸ء کو اقوامِ متحدہ کی طرف سے کابل میں ایک کانفرنس منعقد ہوئی۔ ایجنڈا تھا: ترقی پذیر ممالک میں انسانی حقوق۔ اس کانفرنس میں متفقہ طور پر یہ قرارداد منظور کی گئی کہ انسانی حقوق کابل ان ممالک میں مؤثر نہیں ہو سکتا جہاں معاشی وسائل بہت کم ہوں اور آبادی کا غالب حصہ قوتِ لایموت پر گزارا کر رہا ہو۔ (اسلامی ہیومن رائٹس کے چند روشن رُخ از ڈاکٹر غزل کاشمیری: محدث، جولائی ۱۹۹۶ء)

گویا انسانی حقوق کے نام نہاد خالق خود تسلیم کر رہے ہیں کہ ان پر عمل پیرائی مشروط ہے۔ اور کون نہیں جانتا کہ شروع دن سے ہی اقوامِ متحدہ پر مغربی ممالک کی اجارہ داری رہی ہے اور یہ ادارہ مکمل طور پر امریکی اور دیگر مغربی قوتوں کی لوٹری بن چکا ہے۔ انہوں نے کبھی انسانی حقوق کی پاسداری نہیں کی اگر کی ہے تو اپنے مفادات اور ترجیحات کو مد نظر رکھ کر۔ امریکہ اس سلسلہ میں اس قدر آگے نکل چکا ہے کہ ۱۹۵۳ء میں خود اس کے اپنے سیکرٹری آف سٹیٹ جان فوسٹر ڈولس John Foster Dulles کو کہنا پڑا:

”آئین ہاؤس کی انتظامیہ نہ تو معاہدات کی سختی سے پابندی کرتی ہے اور نہ ہی دنیا میں انسانی آزادی کو حاصل کرنے کے لئے کوئی سنجیدہ اور مؤثر قدم اٹھا رہی ہے۔“ مترجم

دیکھ رہا ہے۔ کسی نے سچ کہا تھا:

رَمَنْ بَدَأَهَا فَاَنْسَلَتْ كَهـ ”اپنا عیب دوسروں کے سر تھوپا اور خود کھسک گیا“

امریکہ اور اس کے گماشتے خود انسانی حقوق کی دھجیاں بکھیر رہے ہیں اور خود ہی اس کے محافظ بنے بیٹھے ہیں آج ساری دنیا یہ طرفہ تماشا دیکھ رہی ہے اور اب مغرب کا دوہرا معیار اور منافقانہ پالیسیاں کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہیں۔ (حقوق الانسان والسياسة الدولية، ڈیوڈ بی فورسایت: تعریب محمد مصطفیٰ غنیم)

## اسلام؛ حقوق انسان اور غلامی

آج مغرب اپنی کج فہمی اور کوتاہ بینی کی وجہ سے جس مسئلہ پر اسلام کو سب سے زیادہ مطعون ٹھہرا رہا ہے اور اسلام کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا کر رہا ہے، وہ مسئلہ غلامی ہے۔ مغرب کا اس مسئلہ کو اچھالنا دراصل اسلامی احکام کی غلط تفہیم کا نتیجہ ہے۔ ہم تو کہتے ہیں کہ غلامی کے بارے میں جو نقطہ نظر اسلام نے دیا ہے وہ اس کے کامل و برتر، روشن خیال، بلند ظرف ہونے کی بڑی واضح دلیل ہے اور اسلام میں غلامی کا جو تصور اس کا دشمن (مغرب) پیش کر رہا ہے، وہ سراسر غلط اور بے بنیاد ہے۔

یہ قرآن مجید کا اعجاز ہے کہ رب العالمین نے اس میں اسلام کے قانون غلامی کو نہایت تفصیل اور وضاحت سے بیان کر دیا ہے: ﴿يَقْضُ الْحَقَّ وَهُوَ خَيْرُ الْفَاصِلِينَ﴾ (الانعام: ۵۷) ’وہی (اللہ) حق کو بیان کرتا ہے اور وہی سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔‘

پھر وہ حقوق کسی مفسر کے استنباط کا نتیجہ نہیں بلکہ صریحاً وہ حقوق موجود ہیں جن کا تحفظ مطلوب ہے۔ پھر اسلام کا قانون غلامی، عدل و انصاف کا ایسا نمونہ ہے جس میں عدل کی وسعت درجہ کمال کو پہنچی ہوئی ہے۔ اس سے بڑھ کر کیا انصاف ہوگا کہ اسلام جہاں غلام کو یہ حکم دیتا ہے کہ وہ اپنے آقا کے حقوق پورے کرے، وہاں آقا کو بھی یہ حکم دیتا ہے کہ وہ اپنے غلام کے حقوق پورے کرے اور اسے خبردار کرتا ہے کہ روز قیامت تجھے اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے سامنے جوابدہ ہونا ہے۔

اصولاً اور عملاً اسلام کا قانون غلامی وہ واحد قانون ہے جس نے نہ صرف بنیادی انسانی حقوق کا جامع تصور دیا بلکہ وہ شخصی اغراض اور ذاتی مفادات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے شروع دن سے ان حقوق کا محافظ اور علمبردار بھی ہے اور اس نے غلام اور آقا کے درمیان مساوات، یکسانیت اور باہمی رحم دلی اور ہمدردی کا ایسا تعلق پیدا کر دیا ہے جس سے عظمت اسلام کی ایسی دلکش اور خوبصورت تصویر صاف جھلکتی دکھائی دیتی ہے جو دھوکہ، فراڈ، مبالغہ اور لوگوں کے لئے ملمع سازی سے یکسر پاک ہے۔ اس کے برعکس مغرب کا انسانی حقوق کا نعرہ سراسر، فراڈ، دھوکہ اور صریح ڈھونگ ہے جو اسلام اور مسلمانوں کو کچننے کیلئے رچایا گیا ہے

اس پس منظر کو ذہن میں رکھتے ہوئے آئیے ان انسانی حقوق کا مطالعہ کرتے ہیں جو فقہاء اسلام نے شریعت محمدی کی روشنی میں 'غلاموں' کے بارے میں مدون کئے ہیں:

اسلام وہ مذہب ہے جس نے کسی بھی شخص کو محض نسل، وطن، رنگ، زبان اور دین و مذہب کی بنیاد پر غلام بنانا حرام قرار دیا ہے۔ جب مصر کے گورنر حضرت عمرو بن العاص کے بیٹے نے ایک قبطی کو بلا وجہ مارا تھا تو حضرت عمرؓ نے برسر عام اس کو سزا دی اور ساتھ ہی گورنر کو قہر آلود نگاہوں سے دیکھتے ہوئے فرمایا:

”متى استعبدتم الناس وقد ولدتهم أمهاتهم أحرارا“ (۴)

”تم نے کب سے لوگوں کو اپنا غلام بنانا شروع کیا ہے، جبکہ ان کی ماؤں نے انہیں آزاد جنا تھا“

اسی طرح صحیح بخاری میں ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”ثلاثة أنا خصمهم يوم القيامة وذكر منهم ورجل باع حراً فأكل ثمنه“ ”روزِ

قیامت تین شخص ایسے ہوں گے کہ میں ان کے خلاف وکیل بن کر اللہ کی عدالت میں پیش ہوں گا،

ایک ان میں سے وہ شخص ہوگا جس نے کسی آزاد آدمی کو فروخت کر کے اس کی قیمت کھائی ہوگی۔“

۲۔ اسلام غلامی کا سبب صرف کفر کو قرار دیتا ہے کیونکہ جو شخص اللہ کے احکام اور پیغمبر کے فرمان کو

تسلیم کرنے سے انکار کر رہا ہے، وہ خواہ شکل و صورت کے لحاظ سے پوری کائنات سے حسین کیوں نہ ہو اور

حسب و نسب، جاہ و جلال اور مقام و مرتبہ کے اعتبار سے لوگوں سے معزز کیوں نہ ہو، لیکن درحقیقت ایسا

شخص انسان کہلوانے کا بھی روادار نہیں ہے کہ اس کے حقوق کا تحفظ کیا جائے بلکہ وہ عظمت آدم اور شرف

انسانیت کی سطح سے گر کر ڈھور ڈنگروں بلکہ ان سے بھی حقیر ترین مخلوق کا فرد بن چکا ہے۔ ایسے لوگوں کے

بارے میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلَّ هُمْ أَضَلُّ﴾

”یہ لوگ ڈنگر ہیں بلکہ ڈنگروں سے بھی زیادہ بدتر۔“

(۴) یہ وہ فصیح و بلیغ جملہ تھا جو آج سے چودہ سو سال قبل امیر المومنین حضرت عمر بن الخطابؓ کی زبان سے ادا ہوا تھا۔ لیکن

افسوس کہ آج ہم نے اپنے مزاج و نفسیات پر مغرب کو مکمل طور پر سوار کر لیا ہے۔ ہمارا جدت پسند طبقہ ان کے فیشن کی نقالی

اور خیالات کی جگالی میں فخر محسوس کرتا نظر آتا ہے۔ حدیہ کہ محاورات اور اصلاحات تک کے لئے ہم مغرب کے کاسہ لیس

بن گئے ہیں۔ اس کا اندازہ اس مثال سے لگایا جاسکتا ہے کہ مشہور فرانسیسی مفکر روسو نے اپنی کتاب سوشل کنٹریکٹ میں ایک

جملہ لکھا تھا کہ ”انسان آزاد پیدا ہوا تھا لیکن وہ ہر جگہ زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔“

بس پھر کیا تھا کہ ہمارے روشن خیال اور جدت پسند طبقہ نے اسے الہامی کلام سمجھ لیا۔ ہم نے اسے اپنی تحریروں کا

عنوان بنایا۔ تقریروں کا موضوع بنایا اور کئی تنظیموں نے اسے اپنا ماٹو قرار دیا۔ ہمارے روشن خیال مفکرین کی ذہنی مرعوبیت کی

انتہا دیکھئے کہ یہ جملہ ۱۷۵۰ء میں روسو کی قلم سے نکلا تھا لیکن کسی کو یہ خیال نہ آیا کہ روسو کی یہ بات نرالی اور انوکھی نہیں بلکہ

اسلام ہی کا چہرہ ہے اس لئے کہ اس سے کہیں زیادہ فصیح و بلیغ اور پراثر جملہ روسو سے تقریباً گیارہ سو سال قبل ۶۱۳ء کے لگ

بھگ امیر المومنین حضرت عمر فاروقؓ کی زبان مبارک سے آشنا ہو چکا ہے۔ (مترجم)

چونکہ کفر اور شرک اسلام کے نزدیک ظلم عظیم ہے: جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿إِنَّ الشُّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ﴾ ”بے شک شرک البتہ بہت بڑا ظلم ہے“

لہذا اس کا مرتکب ظالم اور مجرم ہے: ﴿وَالْكَافِرُونَ هُمُ الظَّالِمُونَ﴾ (البقرة: ۲۵۴)  
”یقیناً یہی لوگ ظالم ہیں“

۳۔ پھر اسلام ہر کافر کو غلام نہیں بناتا بلکہ صرف اس کافر کو غلامی کا طوق پہناتا ہے جو اسلام کے خلاف صف آرا، مسلمانوں سے برسر پیکار اور دعوت الی اللہ کے راستے میں رکاوٹیں ڈال رہا ہے، جو دوسروں کو کفر و شرک کے ظلمت کدوں سے نکلنے اور اسلام کی تجلیات سے فیض یاب ہونے سے روکتا ہے۔ جو بندوں کو بندوں کی غلامی سے نکالنے اور اللہ کی غلامی کا طوق لگے میں ڈالنے سے منع کرتا ہے اور اسلام کی تبلیغ کے سامنے دیوار بن کر کھڑا ہو گیا ہے۔ ایسے شخص کو غلام بنانا کسی طور بھی ظلم قرار نہیں دیا جاسکتا۔

نیز جب کافر مسلمانوں سے برسر پیکار اور اسلام کے خلاف صف آرا ہو جائے تو تب بھی اسلام ہر کسی کو قطعاً یہ اجازت نہیں دیتا کہ وہ جس کو چاہے پکڑ کر غلام بنالے اور کہے: یہ میرا غلام ہے، بلکہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ، حکیم و خبیر ذات نے اس کے لئے ایک ضابطہ اور قانون بنا دیا ہے کہ کس کافر کو غلام بنایا جاسکتا ہے اور کس کو نہیں۔ اس قانون کے تحت کوئی بھی شخص خلیفہ المسلمین کی اجازت کے بغیر کسی کافر کو غلام نہیں بنا سکتا، گویا اللہ تعالیٰ نے اس معاملہ کو امیر المومنین کی صوابدید سے مربوط کر کے اسے ایک قانون اور رضابطہ کے تابع کر دیا ہے۔ فرمان الہی ہے:

﴿فَإِمَّا مَنَّا بَعْدُ وَإِمَّا فِدَاءً حَتَّى تَضَعَ الْحَرْبُ أَوْزَارَهَا﴾ (محمد: ۴)

”پھر اس کے بعد ان پر احسان کرو یا تاوان لے کر چھوڑ دو۔“

۴۔ پھر اس پر بس نہیں کیا بلکہ غلاموں کو غلامی کے طوق سے نجات دلانے کے لئے ان کو آزاد کرنے کی ترغیب دی اور اس پر بہت بڑے اجر و ثواب کی نوید سنائی۔ اس کے علاوہ ان کی آزادی کے لئے مختلف دروازے کھول دیئے۔ مثلاً غلام کی آزادی کو کفارہ قرار دیا اور قتل، ظہار اور دیگر متعدد صغیرہ اور کبیرہ گناہوں کے لئے اس کفارہ کو واجب ٹھہرایا۔

آزادی کی ایک صورت ’مکاتبت‘ کو جائز قرار دے کر غلام کو یہ حق دیا کہ وہ کچھ رقم دے کر اپنے آقا سے معاہدہ کر کے اپنی آزادی کا پروانہ حاصل کر لے اور پھر ایسے غلاموں کو رقم بہم پہنچانے کے لئے انہیں زکوٰۃ کا مستحق قرار دیا اور قرآن میں فی الرقاب کے جملہ سے فرض زکوٰۃ میں سے ایک حصہ ان کے لئے مقرر کر دیا۔ اسی طرح لوگوں کو غلامی کے چنگل سے نکالنے کے لئے ایک اور نظام رائج کیا، جو کتب فقہ اسلامی میں ’تدبیر‘ کے نام سے معروف ہے۔ یعنی اگر آقا اپنے غلام سے کہہ دے کہ تو میری وفات کے بعد

آزاد ہے تو شرعی لحاظ سے آقا کی وفات کے بعد کوئی شخص اسے غلام بنانے کا مجاز نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح اگر کوئی لونڈی اپنے آقا کے کسی بچے کو جنم دے تو وہ اس کے بعد آزاد تصور ہوگی اور آقا کے لئے اس کو غلام بنانا یا اسے بیچنا حرام ہوگا۔

پھر اسلام نے غلاموں کی آزادی پر اجر عظیم کی نوید سنائی۔ حتیٰ کہ خود نبی اکرم ﷺ نے جب ایک باندی سے پوچھا کہ اللہ کہاں ہے؟ اس نے کہا آسمان میں۔ پوچھا: میں کون ہوں؟ باندی نے کہا: آپ اللہ کے رسول ہیں۔ تو آپؐ نے اس کے آقا کو حکم دیا کہ اسے آزاد کر دو، یہ مؤمنہ ہے۔ (مسلم: ۵۳۷)

البتہ اسلام نے جھوٹ اور اسلام قبول کرنے کے جھوٹے دعوؤں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے لئے غلاموں کے محض اسلام میں داخل ہونے کو آزادی کا سبب قرار نہیں دیا۔

۵۔ اسلام آقا پر لازم قرار دیتا ہے کہ وہ غلام کے اخراجات کا بندوبست کرے۔ اگر اسے سواری کی ضرورت ہو تو اسے سواری مہیا کرے۔ پھر اخراجات کی یہ ذمہ داری اس کی محنت کا معاوضہ نہیں بلکہ اسلام اسے غلام کا بنیادی حق قرار دیتا ہے۔ نیز آقا کے لئے حرام قرار دیا کہ وہ غلام کو ایسے کام کی مشقت دے جو اس کی طاقت سے باہر ہو۔ آپؐ نے فرمایا:

”للمملوك طعامه وكسوته ولا يكلف من العمل إلا ما يطيق“ (مسلم: ۱۶۶۲)

”غلام کو کھانا اور پہناؤ اور اسے وہ کام نہ دو جو اس کی طاقت سے باہر ہو۔“

اسی طرح شریعت نے غلام کو کسی ایسے کام کی مشقت سے دوچار کرنا حرام قرار دیا جو اس کی بیماری کا باعث بن جائے۔ پھر آقا کا یہ فرض قرار دیا کہ وہ غلام کو آرام اور نماز کے لئے وقت فراہم کرے۔ امام جحاویؒ اپنی کتاب زاد المستقنع میں فرماتے ہیں:

”آقا کا یہ فرض ہے کہ وہ غلام کو قیلولہ، نیند اور نماز کے لئے وقت دے۔ اس کی اولاد سے ان کے بڑے ہونے تک کسی قسم کا کام نہیں لیا جائے گا، حتیٰ کہ شریعت نے انہیں مالی غنیمت سے حصہ عطا فرمایا ہے۔ اسی طرح اگر مالک اپنی وراثت کا کچھ حصہ غلام کے لئے مقرر کر دے تو اسلام اسے اس وراثت کا حق دار قرار دیتا ہے۔“ فرمانِ الہی ہے:

﴿قَدْ عَلِمْنَا مَا فَرَضْنَا عَلَيْهِمْ فِيْ اَرْوَاحِهِمْ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ﴾ (الاحزاب: ۵۰)

”ہم جانتے ہیں کہ ہم نے مومنوں پر ان کی بیویوں اور مقبوضہ کنیزوں کے بارے میں کیا فرض کیا ہے۔“

پھر غلام اپنے آقا کی جو خدمت انجام دیتا ہے اس کے عوض شریعت نے اس سے بعض شرعی احکام ساقط کر دیئے ہیں۔ مثال کے طور پر غلام پر جمعہ اور حج اور بعض دیگر احکام فرض نہیں ہیں۔

۶۔ اسلام غلاموں کے جسمانی حقوق کے ساتھ معنوی حقوق کے تحفظ کی بھی ضمانت دیتا ہے۔ لہذا

ان کی توہین اور تحقیر کرنا اور انہیں مارنا حرام قرار دیا۔ امام نوویؒ نے اپنی کتاب ’ریاض الصالحین‘ کے باب: غلام، جانور، عورت اور بچے کو بغیر کسی عذر کے مارنا اور مار میں حد ادب سے تجاوز کرنے کی ممانعت کے ضمن میں حضرت ابوسعود بدریؓ کے متعلق ایک حدیث ذکر کی ہے اور امام مسلمؒ نے بھی اس حدیث کو اپنی صحیح میں ذکر کیا ہے۔ حضرت ابوسعود بدریؓ بیان کرتے ہیں:

”میں ایک دفعہ اپنے غلام کو کوڑے سے پیٹ رہا تھا تو مجھے پیچھے سے آواز سنائی دی: ”اے ابوسعود! ہوش سے کام لو؟“ لیکن میں شدتِ غضب سے مغلوب، آواز کو سمجھ نہ سکا۔ پھر جب آواز قریب ہوئی تو میں نے مڑ کر دیکھا کہ اللہ کے پیغمبرؐ پکار رہے تھے: اے ابوسعود، ہوش کرو! اے ابوسعود، ہوش سے کام لو۔ میں نے سنا اور کوڑا زمین پر پھینک دیا۔ پھر آپؐ نے فرمایا: اے ابوسعود! اس بات کو قطعاً فراموش نہ کرنا کہ جتنا اختیار تجھے اس غلام پر ہے، اللہ کو تجھ پر اس سے زیادہ اختیار ہے، میں نے کہا: اللہ کے رسول ﷺ! آج کے بعد کسی غلام کو ہاتھ تک نہیں لگاؤں گا اور اس غلام کو اللہ کی راہ میں آزاد کرتا ہوں۔ یہ سن کر پیغمبر علیہ السلام نے فرمایا: اگر تو ایسے نہ کرتا تو آگ کی لپیٹ سے بچ نہ سکتا۔“ (مسند احمد: ۶/۲۹۰)

اسلام نے جس قدر غلاموں کے حقوق کا تحفظ کیا ہے، اس کا اندازہ آپ ﷺ کی اس وصیت سے لگایا جاسکتا ہے جو آپ ﷺ نے آخری وقت میں اپنی امت کو الوداع کہتے ہوئے فرمائی تھی، فرمایا:

”الصلوة وما ملکت أیمانکم“ ”نماز اور غلاموں کا خیال رکھنا“ (مسلم، رقم: ۱۶۵۹)

یقیناً یہ حدیث دشمنانِ اسلام کے تمام اعتراض کا نہایت بلغ انداز میں رد کرتی ہے اور وہ مسلمان جو دشمن کے پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر ان کے نظریاتی حملوں کے سامنے ہتھیار ڈالنے کے لئے پرتول رہے ہیں انہیں ثابت قدمی اور نیا ولولہ عطا کرتی ہے۔ اور وہ مسلمان جو مغربی پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر یہ کہہ رہے ہیں کہ قانونِ غلامی بتقاضا ضرورت مشروع کیا گیا تھا اور اب یہ منسوخ ہو گیا ہے، ان کے تمام شکوک کو رفع کرتی دیتی ہے۔ اسلام کا یہ دستور ہمیشہ باقی رہے گا اور ہمارا یہ یقین ہے کہ جب تک دنیا باقی ہے اور لیل و نہار کی گردش جاری ہے، اس وقت تک اسلام کا یہ قانون غلامی قائم و دائم ہے۔ خواہ کوئی اسے تسلیم کرے یا نہ کرے: ﴿وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰی أَمْرِهِۦ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ﴾ (یوسف: ۲۱)

”اور اللہ اپنا حکم نافذ کرنے پر غالب ہے لیکن اکثر لوگ یہ بات نہیں جانتے۔“ ☆☆

(۵) محمد مصطفیٰ ﷺ کے عہد میں غلاموں پر نہایت وحشیانہ مظالم توڑے جاتے تھے اور غلامی کی غلط صورتیں معاشرے میں اس طرح رچ بس چکی تھیں کہ ان کا ختم کرنا فوری طور پر ممکن نہ تھا۔ لہذا آپ نے ابتدائی طور پر اس طبقہ مظلوم کو ظلم و ستم سے بچانے کے لئے سخت ہدایات جاری فرمائیں اور ان کو وہ حقوق دیئے جس سے آقا اور غلام کی تمیز بالکل ختم ہو گئی۔



MONTHLY

## MUIHADDIS

LAHORE

- عناد اور تعصب قوم کے لیے زہر ہلاہل کی حیثیت رکھتے ہیں..... لیکن تعصبات سے بالاتر رہ کر افہام و تفہیم اُمت کے لیے رحمت کا باعث ہے۔
- علوم جدیدہ سے ناواقفیت اور انکار، انسانی ارتقاء کو تسلیم کرنے میں بخل کا درجہ رکھتے ہیں..... لیکن قدیم علوم اسلامیہ کو فرسودہ قرار دینا اور مذہبی روایات کے حاملین کو دقتیانوس بنانا اُمت کی تباہی کا سبب ہے۔
- غیر مذاہب کے بارے میں معاندانہ رویہ اختیار کرنا اسلامی اقدار کے منافی ہے..... لیکن دین اسلام پر غیر مذاہب کے حملوں کا دفاع نہ کرنا اور اسلام کی تبلیغ کا فریضہ سرانجام نہ دینا حمیت دینی اور غیرت اسلامی سے یکسر انحراف ہے۔
- تبلیغ دین اور اشاعت اسلام میں حکمت عملی کو نظر انداز کر دینا مصالح دینیہ کے خلاف ہے لیکن حلال اور حرام کے امتیاز میں رواداری برتنا اور قوانین و مسائل اسلامیہ کو نرم کر دینا اسلامی روح کو کمزور کرنے کے مترادف ہے۔
- آئین و سیاست سے بیگانہ ہو کر عبادت کے لیے گوشہ نشین ہو جانا زندگی سے فرار ہے..... لیکن جدا ہو دین سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی
- جاہل کو دور ہی سے سلام کر دینا عباد صالحین کے اوصاف میں داخل ہے..... لیکن جاہلیت کو مٹانا اور باطل کا تعاقب کرنا عین جہاد ہے۔

۞ ۞ ۞

..... اگر آپ ایسا مصنفہ اللہ تعالیٰ مدد فرمائیے کہ میں گتے ہیں تو

مِلّٰت

کا مطالعہ فرمائیے آپ اس کو ان جملہ صفات و حسنات سے مزین پائیں گے، ان شاء اللہ!  
کیونکہ اس کے مصنفین اسی مخصوص طرز فکر کے حامل ہوتے ہیں۔

زیر سالانہ: ۲۰۰ روپے

فی شمارہ: ۲۰ روپے

ISLAMIC RESEARCH COUNCIL

99-J, Model Town, Lahore-54700. Phones: 5866476, 5866396